جنوری ۱۹۶۶ء

جلد ۶۴ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ہر مسلمان کے لیے قابلِ مطالعہ کتب

محسنِ انسانیت
مؤلف: ابو السلام نعیم صدیقی

- نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ پر مستند اور جامع کتاب — ایک نئے انداز میں۔
- حضورؐ کی ہمہ گیر شخصیت کا تحریکی نقطۂ نظر سے مطالعہ۔
- پیغمبرانہ بصیرت، تدبر و حکمت کی آئینہ دار

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۱۵۰۰ روپے سستا ایڈیشن ۱۱٫۰۰ روپے

حیاتِ طیبہ
از: ابو سلیم محمد عبدالحی

- نبی اکرمؐ کی سیرتِ پاک آسان اور عام فہم انداز میں۔
- مستند واقعات، ایمان پرور جذبات سے بھرپور۔
- حضورؐ کی قیادت میں برپا شدہ تحریک کا مختصر مگر جامع نقشہ
- ایمان و عمل پر ابھارنے والی ایک بیش قیمت کتاب۔

صفحات ۲۸۰ قیمت ۳٫۵۰ روپے

ختمِ نبوت
مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

- ختمِ نبوت کے بارے میں ۱۴ صدیوں کے جید علمائے امت کی متفقہ تصریحات۔
- منکرینِ ختمِ نبوت کے اعتراضات کا مدلل جواب

آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت

اعلیٰ ایڈیشن خوبصورت سرورق ۶۰ پیسے

سستا ایڈیشن فی نسخہ ۲۰ "

قادیانی مسئلہ
مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

اور اسکے سیاسی، دینی اور تمدنی پہلو

- پاکستان میں قادیانیت کے اثرات۔
- قادیانی عقائد کا دینی، سیاسی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے جائزہ
- قادیانیت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب

قیمت مجلد ۵٫۷۵ روپے

سستا ایڈیشن ۳٫۷۵ "

مرتد کی سزا
مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

اسلامی قانون میں

- اسلامی قانون میں ارتداد کی نوعیت و حیثیت
- اسلام کے ایک اہم قانون کی تشریح مضبوط دلائل کے ساتھ
- مخالفین کے اعتراضات اور ان کے مسکت و مدلل جوابات

آفسٹ کی حسین طباعت قیمت ایک روپیہ

تجدید و احیائے دین
مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

- تجدیدِ دین کی حقیقت اور اس کی اہمیت
- مجددینِ ملت کے کارناموں کا تحقیقی مطالعہ
- تجدد اور تجدید کا فرق۔

آفسٹ کی خوبصورت طباعت

قیمت مجلد ۲٫۷۵ روپے سستا ایڈیشن ۱٫۷۵ روپے

فون = ۶۸۳۴۱

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ○ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ ○ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۴ | جنوری ۱۹۶۶ء | عدد ۵

چندہ سالانہ	دفتر رسالہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے - ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یہ محض فضلِ ربّی کا نتیجہ ہے کہ اُس نے ہم جیسے ناتواں اور تہی دست لوگوں کو بھارتی جارحیت کے موقع پر ملک اور کشمیر کے مظلوم بھائیوں کی خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ ان مخدوش حالات میں اپنے وسائل کی کمی کے باوجود جو تھوڑی سی خدمت جماعت اسلامی کے کارکن کر سکے ہیں اُس میں ہماری کوشش کو کوئی دخل نہیں، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی نوازش اور قوم کے مخلصانہ تعاون کی رہینِ منّت ہے۔ ہمیں اس حقیقت کے اظہار کی ضرورت کچھ اس وجہ سے پیش نہیں آئی کہ ہم خدانخواستہ اپنی خدمات سے لوگوں کو آشنا کرنے کے آرزومند ہیں، یا قوم اور ملک پر کوئی احسان جتلانا چاہتے ہیں، یا ان کے ذریعہ ملک اور بیرونِ ملک میں اپنی ساکھ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ علیم و خبیر ذات جس کے علم سے کوئی مادّی شے تو کیا کوئی موہوم احساس تک پوشیدہ نہیں، ان جذبات کو اچھی طرح جانتا ہے جن کے تحت ہم نے اپنا یہ فرض اپنی حدِ وسع تک سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے آج ان صفحات میں اس کا تذکرہ صرف اس غرض کے لیے کیا ہے کہ ہمارے رفقاء اور ہمارے کام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات، ان وسیع تر مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جن کے حصول کے لئے ہم نے یہ سب کچھ کیا ہے یا آئندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہمارے ہر رفیق اور ہمدرد و معاون کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جماعت

اسلامی محض خدمت خلق کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس طرح کے دوسرے ادارے جو ملک میں کام کر رہے ہیں وہ مفید اور کارآمد نہیں ہیں۔ ہم اُن کی افادیت کے دل وجان سے قائل ہیں، اُن کی خدمات کے معترف ہیں اور اُن سے ہر مفید کام کے سلسلے میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ہم جو رفاہی کام کر رہے ہیں اُس کا مقصد محض معاشرتی خدمت نہیں، بلکہ ہمارے یہ سارے کام ہماری زندگی کے سب سے مقدم، سب سے بنیادی، سب سے ضروری اور سب سے اہم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اور وہ صرف ایک ہی ہے یعنی رضائے الٰہی۔ اس ایک مقصد کے علاوہ ہمارا کوئی دوسرا مقصد نہیں، اس ایک غایت کے علاوہ ہماری کوئی دوسری غایت نہیں اس ایک آرزو کے علاوہ ہماری کوئی دوسری آرزو نہیں کہ ہمارا خالق و مالک ہم سے راضی ہو۔ اُسی ذاتِ بے ہمتا کی خوشنودی ہمارا مطلوب و مقصود ہے۔ اگرچہ ہم اپنی برادری، اپنے خاندان، اپنی ملت کے ہر فرد بلکہ نوعِ انسانی کے ہر رکن کو حتی المقدور خوش رکھنا چاہتے ہیں، اور کسی کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتے، لیکن یہ سب کچھ اُس ذات کی خوشنودی کے تابع ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے، جسے ہم نے پورے شعور اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنا الٰہ، رب اور مالک تسلیم کیا ہے، اور جس کی خاطر ہم جینے اور مرنے کا عہد کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے کسی کام سے پوری دنیا ہم سے خوش ہوتی ہو مگر مالک الملک کی ناراضی کا اس میں ذرہ برابر بھی خدشہ ہو تو وہ ہمارے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ہے جسے ہم کرنے کے لیے جیتے جی کبھی تیار نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اگر کسی کام سے مالک الملک کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہو، خواہ اُس کے انجام دینے سے پوری دنیا ہمارے خون کی پیاسی ہو جائے، تو ہم پوری دنیا کے دباؤ اور دشمنی کو نظرانداز کر کے وہی کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس سے ہمیں اپنے مالک الملک کی رضامندی حاصل کرنے کی توقع ہو۔

ہم ملتِ اسلامیہ کے افراد ہیں، اس بنا پر اس کے دکھ ہمارے دکھ ہیں اور اس کے سکھ ہمارے سکھ ہیں۔ جو اُفتاد بھی اُس پر پڑتی ہے اُس کی لپیٹ میں ہم بھی اُسی طرح آتے ہیں جس طرح کہ ہمارے

اسلامی محض خدمت خلق کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس طرح کے دوسرے ادارے جو ملک میں کام کر رہے ہیں وہ مفید اور کارآمد نہیں ہیں۔ ہم اُن کی افادیت کے دل و جان سے قائل ہیں، اُن کی خدمات کے معترف ہیں اور اُن سے ہر مفید کام کے سلسلے میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ہم جو رفاہی کام کر رہے ہیں اُس کا مقصد محض معاشرتی خدمت نہیں، بلکہ ہمارے یہ سارے کام ہماری زندگی کے سب سے مقدم، سب سے بنیادی، سب سے ضروری اور سب سے اہم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اور وہ صرف ایک ہی ہے یعنی رضائے الٰہی۔ اس ایک مقصد کے علاوہ ہمارا کوئی دوسرا مقصد نہیں، اس ایک غایت کے علاوہ ہماری کوئی دوسری غایت نہیں، اس ایک آرزو کے علاوہ ہماری کوئی دوسری آرزو نہیں کہ ہمارا خالق و مالک ہم سے راضی ہو۔ اُسی ذاتِ بے ہمتا کی خوشنودی ہمارا مطلوب و مقصود ہے۔ اگرچہ ہم اپنی برادری، اپنے خاندان، اپنی ملت کے ہر فرد بلکہ نوعِ انسانی کے ہر رکن کو حتی المقدور خوش رکھنا چاہتے ہیں، اور کسی کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتے، لیکن یہ سب کچھ اُس ذات کی خوشنودی کے تابع ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے، جسے ہم نے پورے شعور اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنا اللہ، رب اور مالک تسلیم کیا ہے، اور جس کی خاطر ہم جینے اور مرنے کا عہد کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے کسی کام سے پوری دنیا ہم سے خوش ہوتی ہو مگر مالک الملک کی ناراضی کا اس میں ذرہ برابر بھی خدشہ ہو تو وہ ہمارے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ہے جسے ہم کرنے کے لیے جیتے جی کبھی تیار نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اگر کسی کام سے مالک الملک کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہو، خواہ اُس کے انجام دینے سے پوری دنیا ہمارے خون کی پیاسی ہو جائے، تو ہم پوری دنیا کے دباؤ اور دشمنی کو نظر انداز کر کے وہی کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس سے ہمیں اپنے مالک الملک کی رضامندی حاصل کرنے کی توقع ہو۔

ہم ملّتِ اسلامیہ کے افراد ہیں، اس بنا پر اس کے دکھ ہمارے دکھ ہیں اور اس کے سکھ ہمارے سکھ ہیں۔ جو اُفتاد بھی اُس پر پڑتی ہے اُس کی لپیٹ میں ہم بھی اُسی طرح آتے ہیں جس طرح کہ ہمارے

دوسرے بھائی آتے ہیں۔اس ملت کے ایک ایک فرد سے ہمیں دینی تعلق کی بنا پر غیر معمولی محبت اور وابستگی ہے۔اُس کی تکلیف سے ہمیں بے حد اذیت پہنچتی ہے اور ہم اُسے جلد از جلد دُور کرنے کے لیے مضطرب اور پریشان ہوتے ہیں۔

اسی طرح یہ ملک جس میں ہم رہتے ہیں یہ ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔اس سے ہمیں ایک جذباتی لگاؤ اور قلبی تعلق بھی ہے، اور اسی سرزمین میں ہم دینِ حق کا بول بالا کرنے کی بھی امید رکھتے ہیں جو ہماری تمام کوششوں کا اصل مقصود ہے۔علاوہ بریں یہ ظاہر ہے کہ اس کی خوشحالی سے ہماری خوشحالی وابستہ ہے اور اس کی بربادی ہماری اپنی بربادی ہے۔اگر یہ آزاد ہے تو ہم یہاں آزادی کا سانس لے سکیں گے اور خدانخواستہ یہ غلام بن گیا تو ہم دنیا میں ذلیل وخوار بن کر رہ جائیں گے۔اس کی سربلندی سے ہماری عزت ہوگی اور اس کی رسوائی سے ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی۔ہم فاترالعقل نہیں ہیں کہ ان حقائق کو جانتے بوجھتے اس ملک کے خیرخواہ نہ ہوں اور اس کی آزادی، خوشحالی اور ترقی کے لیے تن، من، دھن قربان کرنے سے دریغ کریں۔

ہمارے اس خطۂ پاک کے چند علاقے ابھی تک دشمن کے غاصبانہ قبضے میں ہیں۔اس دشمن نے جو فکر و نظر کے اعتبار سے انتہائی متعصب، تنگ نظر ——————

اور جذبہ و احساس کے اعتبار سے انتہائی ظالم اور سفاک ہے، ان علاقوں کے باشندوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے ہیں۔ایسے مظالم کو اگر درندگی کہا جائے تو خود درندے غضبناک ہو کر اپنی براءت کا اعلان کر دیں اور پورے زور کے ساتھ پکار اٹھیں کہ ان ظالموں کو ہم سے تشبیہ دینا ہماری توہین ہے۔جو لوگ ان کے مظالم کے شکار ہوئے ہیں ان کی دردناک حالت دیکھ کر ہمارے دل کانپ اٹھتے ہیں۔اُن کی بربادی کی داستانیں سُن کر ہمارا ذہنی سکون درہم برہم ہو جاتا ہے، اُن کی تباہی کے نقشے جب ہماری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں تو ہمارا خون کھول اٹھتا ہے اور ہم تڑپ کر رہ جاتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا ہم انسانی حس سے یکسر محروم ہو چکے ہیں؟ کیا ہمارے اندر کوئی غیرت نہیں رہی؟

کیا ہماری دینی حمیت کا جنازہ نکل چکا ہے؟ آخر ہم کب تک اس ظلم کے تماشائی بنے رہیں گے؟

اپنی ملت، اپنے وطن، ابنائے وطن اور مجبور و مظلوم بھائیوں کے بارے میں ہمارے یہ احساسات بالکل فطری ہیں۔ یہ تو اپنے بھائی بندوں اور اپنے ملک کا معاملہ ہے۔ ہم تو دنیا کے کسی کونے میں کسی شخص کو بھی دکھ اور مصیبت میں دیکھ نہیں سکتے۔ انسان تو کیا ہمیں تو جانوروں اور حیوانوں تک کی تکلیفات دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ ہماری یہ دلی آرزو ہے کہ خدا کی مخلوق اُس کی زمین میں امن اور سکون کے ساتھ رہے۔ ظلم اپنی تمام صورتوں میں دنیا سے نیست و نابود ہو۔ انسان اور انسان کے درمیان محبت اور اخوت کے رشتے استوار رہیں۔

ممکن ہے اپنی قوم، اپنے ملک بلکہ بنی نوع انسان کے متعلق ہمارے یہ افکار سُن کر کوئی غیرمسلم بڑی معصومیت کے ساتھ کہہ دے کہ جناب یہ افکار و نظریات کوئی آپ کا امتیاز نہیں، یہ تو انسانیت کا مشترک سرمایہ ہیں۔ ہر انسان جو ذہنی اور جذباتی اعتبار سے صحت مند ہے ہمیشہ اپنی قوم، اپنے وطن اور نوعِ بشری کی بہتری کا آرزو مند ہوتا ہے۔ پھر آپ کو دنیا میں جو امتِ وسط کہا گیا ہے تو اُس کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔ یہ سوال بالکل جائز اور فطری سوال ہے، اور اسی سوال کے جواب میں اسلامی تعلیمات کی روح مضمر ہے اور یہی جماعت اسلامی کی دعوت کا نچوڑ ہے۔

ہم مسلمانوں کو بار بار جس چیز کی طرف توجہ دلا رہے ہیں اور پوری نوعِ بشری کو جو حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انسان کا انسان کے ساتھ تعلق، انسان کا اپنی برادری اور خاندان کے ساتھ تعلق، انسان کا اپنے ملک اور اپنی قوم کے ساتھ تعلق، بلکہ انسان کا اس پوری کائنات کے ساتھ تعلق اُس وقت تک صحیح بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان کا اپنے خالق اور مالک کے ساتھ تعلق صحیح نہج پر استوار نہ ہو۔ عابد و معبود کے درمیان تعلق بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اور اسی کی اساس پر دوسرے تعلقات صحیح طور پر استوار کیے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ تعلق صحیح نہ ہو تو باقی

تعلقات خود بخود بگڑ جاتے ہیں، اور اگر یہ تعلق بالکل درست ہو تو پھر دوسرے تعلقات فطری طور پر بالکل صحیح رُخ اختیار کر لیتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان اپنی قوم سے محبت کرنا چھوڑ دے یا اپنے ملک کی فلاح و بہبود کو نظر انداز کر دے یا انسانیت سے منہ موڑ لے۔ یہ سب رشتے بالکل فطری ہیں اور ہم ان کی اہمیت کے دل وجان سے قائل ہیں۔ اس بنا پر ان رشتوں کو توڑنے کے بجائے ہم انہیں زیادہ مستحکم بنانے کے آرزومند ہیں۔ مگر ہم یہ بات پورے شعور، اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان رشتوں میں تقدیس، ان میں استحکام اور انہیں اپنے جائز فطری حدود میں رکھنے کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے اُس بنیادی رشتۂ عبودیت کو درست کرے جو خالقِ کائنات کے ساتھ اُس کا تعلق جوڑتا ہے۔ دوسرے رشتے سب اسی ایک رشتے کے تابع ہیں اور اُن کی درستی اور مضبوطی کا انحصار سراسر اسی ایک رشتے پر ہے۔

آپ اسی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک جرمن کو اپنے ملک جرمنی سے ایک انگریز کو اپنے وطن انگلستان سے، ایک بھارتی کو اپنے دیس بھارت سے اور ایک پاکستانی کو اپنے خطۂ پاک سے طبعی طور پر کتنا لگاؤ ہے۔ خاکِ وطن سے محبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس فطری احساس میں مسلم وغیر مسلم دونوں یکساں ہیں۔ اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ جرمن، انگریز، بھارتی اور پاکستانی ہر ایک اپنے وطن کو دنیا میں سربلند دیکھنا چاہتا ہے اور اُس کے حفظ و بقا اور فلاح و ترقی کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ ہوتا ہے، جہاں تک وطن کی محبت کا تعلق ہے ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر آپ دیکھیے کہ خدا اور بندے کے درمیان بنیادی تعلق کے فرق کی وجہ سے مسلم وغیر مسلم کے اپنے اپنے وطن سے محبت کے انداز ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہو جاتے ہیں۔ ایک نازی چونکہ اپنے خدا کے ساتھ اپنے رشتے کو صحیح بنیادوں پر استوار نہ کر سکا اس لیے وطن کے ساتھ اُس کی فطری محبت نے اپنے جائز حدود سے تجاوز کر کے ایک خوفناک عذاب کی صورت اختیار کر لی۔ اُس نے جب خدا کی حاکمیت

بالکل مٹ گیا ہے۔ اس کے نزدیک جب معبود صرف وطن ہے تو اُس کے لیے ہر قسم کا جھوٹ، ہر قسم کا مکر و فریب اور ہر قسم کا ظلم و جور بالکل جائز ہے۔ اس جھوٹے معبود نے قدم قدم پر اُسے بہکایا اور اس سے ایسے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کروایا جو انسان تو کیا جانوروں تک کو زیب نہیں دیتے۔ جس اصول پر ملک تقسیم ہُوا اور جس اصول پر ریاستوں کے الحاق کا فیصلہ کیا گیا اور جس اصول کے تحت خود بھارت نے بعض ریاستوں کو بالجبر اپنے ساتھ شامل کر لیا، اس کے مطابق کشمیر آپ سے آپ پاکستان کا جائز حصّہ قرار پاتا ہے۔ لیکن وطن کے جھوٹے الٰہ کی حد سے بڑھی ہوئی حرص کو پُورا کرنے کے لیے اہلِ بھارت نے ہر قسم کے اخلاقی تقاضوں کو پسِ پُشت ڈالتے ہوئے شروع میں اپنے ہمسائے کے حصّہ پر بالکل ناجائز قبضہ کر لیا۔ پھر جب پاکستان نے اس پر شدید احتجاج کیا اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت اس غاصبانہ تسلط کو زیادہ دیر قائم نہیں رکھا جا سکتا تو دیانتداری اور حسنِ نیت سے نہیں، بلکہ مکاری اور فساد نیت کے ساتھ پُوری دنیا کو گواہ بنا کر یہ وعدہ کیا کہ ہمارا یہ قبضہ بالکل عارضی ہے۔ اس ریاست کے مستقبل کا فیصلہ اس کے باشندے ہی کر سکیں گے۔ اپنے اس اعلان کو وہ بار بار دہراتے رہے اور اقوامِ متحدہ میں بھی پوری دنیا کی قوموں کے سامنے انہوں نے اپنے اس قول کا کئی بار اعادہ کیا۔ لیکن آج اس کے لیڈر اپنے قول و قرار اور اپنے وعدوں سے یکسر منحرف ہو کر اور پوری طرح بے شرم بن کر یہ کہہ رہے ہیں کہ کشمیر بھارت کا غیر منفک حصّہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا بھارتی قوم یہ سب کچھ غفلت اور بے شعوری کے عالم میں کر رہی ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اس قوم کا بچّہ بچّہ اس حقیقت سے پُوری طرح واقف ہے کہ کشمیر پر بھارت کا کوئی حق نہیں۔ اُن کا ایک ایک فرد اس بات کو پُوری طرح جانتا ہے کہ کشمیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہے اور لامحالہ اسے پاکستان کے ہی ساتھ شامل ہونا چاہیے۔ ان کا ضمیر جانتا ہے کہ وہ اس مظلوم خطّے کو بھارت کے ساتھ بالجبر ملحق رکھنے کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ سراسر بد دیانتی، بداخلاقی اور ہٹ دھرمی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ کیا وہ نوعِ انسانی کے افراد نہیں۔ اس کا جواب وہی ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ وطن کے جھوٹے

اللہ کے پرستار ہن گروہ انسانیت کے جوہر سے یکسر محروم ہو چکے ہیں، اُن کی نگاہوں پر تنگ نظری اور تعصب کی پٹیاں بندھ چکی ہیں اور اُن کے دل شرافت اور نیکی کے پاکیزہ جذبات سے بالکل عاری ہو گئے ہیں جس اللہ کی انہوں نے بندگی اختیار کی ہے، اُس نے اُن کے ذہن میں یہ بات ڈال دی ہے کہ ہر وہ فعل جائز اور برحق ہے جسے اس اللہ کے لیے مفید خیال کیا جائے چونکہ کشمیر پر قبضے سے اس اللہ کا دائرہ اختیار وسیع ہوتا ہے اس لیے یہ تسلط خواہ اخلاقی اعتبار سے کتنا ہی ناجائز ہو مگر بھارت والوں کے لیے یہ انتہائی ناگزیر ہے۔ اس بنا پر وہ صرف جان و مال ہی کو اس پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ حق، انصاف، نیکی، شرافت، انسانیت، ہر چیز کو اس کی بھینٹ چڑھانے کے لیے آمادہ ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ اُن کے اس غاصبانہ اور غیر اخلاقی طرزِ عمل سے اُن کی قومی ساکھ کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے اور خود ان کے اپنے ملک کے اندر اُن کی یہ ناعاقبت اندیشانہ روش اُن کے لیے کتنے مصائب اور پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہے۔ انہیں اپنے ظالمانہ افعال کے بُرے نتائج سے کوئی سروکار نہیں، انہیں تو صرف اپنے معبودِ باطل کی خوشنودی مطلوب ہے اور اس ایک مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی ہر متاع قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

بھارت کے اس غیر معمولی طرزِ عمل سے ہٹ کر دنیا پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ جھوٹے خداؤں کی پرستش سے اس کرۂ ارضی پر حق و انصاف کا کتنا خون ہو رہا ہے۔ پوری دنیا جانتی ہے کہ کشمیر میں ہندوستان جو کچھ کر رہا ہے وہ سراسر غلط اور ناانصافی ہے۔ اقوامِ متحدہ جسے دنیا میں امن و امان اور قوموں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے کا دعویٰ ہے، اُس میں دنیا کی قریب قریب ساری قوموں کے نمائندوں کے سامنے یہ بات نہایت واضح طور پر طے کی گئی کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کے ہاتھ میں ہے اور وہ استصوابِ رائے سے اپنی ریاست کے الحاق کا تصفیہ کریں گے۔ لیکن عمل کی دنیا میں جو کچھ ہُوا یا آج ہو رہا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ درندے بھی اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی ضابطۂ اخلاق رکھتے ہیں مگر آج ان بڑی قوموں کے سامنے کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں۔ چور، ڈاکو، رہزن اور

لٹیرے بھی اپنے معاملات کسی اصول کے تحت طے کرتے ہیں، مگر تہذیب کے ان علمبرداروں کا کوئی اصول نہیں کشمیر کے بارے میں جو اصول خود ان بڑی قوموں نے وضع کیا اسی اصول کی ان کے ہاتھوں برسوں سے مٹی پلید ہو رہی ہے۔ پہلے تو بھارت کی ناراضی کے خوف سے اس کی پابندی کروانے میں مجرمانہ تغافل سے کام لیا گیا۔ اور اپنے کیے ہوئے فیصلے کے نفاذ میں جان بوجھ کر تاخیر کی گئی۔ پھر اس کے عمل درآمد کی اگر کبھی نوبت بھی آنے لگی تو ایک بڑی طاقت نے جو بزعمِ خویش اپنے آپ کو سامراج اور سامراجی عزائم کی سب سے بڑی دشمن سمجھتی ہے، حق و انصاف کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کر کے بار بار سلامتی کونسل میں ویٹو استعمال کیا اور بڑے شرمناک طریقے سے اس مسئلہ کو کھٹائی میں ڈلوا دیا۔ اس کے بعد اب بھارت اپنے ہر وعدے سے کھلم کھلا منحرف ہو رہا ہے، اور پوری دنیا کے سامنے ایک ایسا ظالمانہ سامراجی طرزِ عمل اختیار کر رہا ہے جس کی اخلاق اور دیانت کوئی بھی تائید نہیں کرتے، مگر دنیا کی بڑی قومیں اُس کی ان ساری غیر اخلاقی حرکات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس کی حمایت پر کمر بستہ ہیں اور ظالم کو اس کے مظالم کی سزا دلوانے کی بجائے اُلٹا مظلوموں کو مطعون کر رہی ہیں۔ اپنے قومی مفادات کی محبت نے اُن کے قلب و دماغ سے حق اور انصاف کا ہر تصور مٹا دیا ہے اور انہیں کچھ یاد نہیں رہا کہ انہوں نے خود کشمیر کے بے کسوں سے کیا وعدے کیے تھے۔

اُن کے دلوں میں اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کیوں ختم ہو گیا ہے؟ اُن کے ذہنوں نے انصاف اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے سوچنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ ان کے ضمیر آخر کیوں مردہ ہو گئے ہیں؟ اور اُن کی انسانیت کی اس بدنصیبی کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ان قوموں نے کائنات کے مالک کو اپنا الٰہ مان کر اُس کے دیئے ہوئے احکام کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی قومیت اور اپنے وطن کو الٰہ بنا لیا ہے۔ اس بنا پر اُس کے مفادات اُن کے نزدیک دنیا کی ہر شے سے عزیز تر ہیں۔ عدل و انصاف، شرافت، اخلاق، قول و قرار کا پاس، سب معبودِ وطن کے مادی مفادات کے تابع ہیں اور چونکہ بھارت پاکستان کے مقابلے میں اُن قوموں کے سامراجی عزائم کی بہتر تکمیل کر سکتا ہے، اس لیے

یہ اس کی صریح بد دیانتی اور ظلم و زیادتی کے باوجود اس کے مقابلہ میں پاکستان کی تائید کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہیں۔

عدل و انصاف سوائے رب العالمین کی عدالت کے اور کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟ حق و باطل کے درمیان امتیاز بجز اُس کی نازل کردہ فرقان کے اور کس کسوٹی سے ہو سکتا ہے؟ اس ایک نورٌ مبین کے سوا اور کون سی روشنی ہے جو انسان کو گمراہیوں اور ضلالتوں سے بچا کر کامیابی کے مقام تک لے جائے؟ باری تعالیٰ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کے سوا اور کون ایسی راہ ہے جس پر چل کر انسان دنیا اور آخرت میں فائز المرام ہو سکے؟ خالق کی ہدایت کے سوا اور کس کی ہدایت انسانیت کی فوز و فلاح کی ضامن ہو سکتی ہے؟ انسان خواہ کتنا ہی نیک نیت اور راستباز ہو، خواہ کتنا ہی صاحبِ بصیرت اور صاحبِ عقل ہو، خواہ کتنا ہی عاقبت اندیش اور صاحبِ تدبّر ہو، خواہ کتنا ہی انصاف پسند اور عادل ہو، بہرحال انسان ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے وہ بشریت کی فطری حدود و قیود اور اس کے فطری تقاضوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ وہ دنیا میں کچھ جبلتوں کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے۔ اُسے شروع ہی سے کچھ ضروریات لاحق ہوتی ہیں۔ وہ ایک خاص آغوش، ایک خاص ماحول اور ایک مخصوص معاشرے میں پرورش پاتا ہے جو اُس کے طرزِ فکر اور اُس کے احساسات و جذبات کی ایک خاص انداز پر صورت گری کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اُس کے اندر ایک خاص نوعیت کی خواہشیں اور آرزوئیں جنم لیتی ہیں، اُس کے اندر ایک مخصوص رجحان اور میلان پرورش پاتا ہے، اُس کے ذہن میں ایک خاص طرز کے تعصبات اُبھرتے ہیں جو اُس کے فکر و نظر کو بالکل قدرتی طور پر غیر متوازن بنا دیتے ہیں۔ وہ بیچارا دنیا کے ہر مسئلہ کو اپنی شخصیت کی عینک سے دیکھنے کے لیے مجبور ہے ایک انسان جو اپنے ذاتی احساسات و رجحانات کے ہاتھوں بے بس ہو اور جس کی نگاہ اپنی حیات کے خم و پیچ میں اُلجھ کر رہ گئی ہو، وہ انسانیت کے وسیع تر مفادات کے متعلق آخر کس طرح سوچ سکتا ہے۔ اُس کا طرزِ فکر لازمی طور پر محدود اور اس کا زاویۂ نگاہ فطری طور پر غیر متوازن ہو گا۔ اُس کے

قلب و دماغ کے ہر گوشے پر اُس کے ذاتی رجحانات، اُس کے خاندانی اور نسلی تعصبات، اُس کے ملکی اور قومی مفادات کی پرچھائیاں پڑیں گی جن سے حقائق اُس کے سامنے ایک مخصوص رنگ میں آئیں گے جب تک انسان اپنی شخصیت کے بنے ہوئے تانے بانے کو خود اپنے ہاتھوں سے تار تار نہ کر دے اس وقت تک اُس کی کوئی رائے بھی سو فیصد غیر جانبدارانہ اور حق و انصاف پر مبنی نہیں ہو سکتی اور یہ چیز بالکل ناممکنات میں سے ہے۔ انسان اپنی شخصیت کے اثرات سے خواہ اپنے آپ کو کتنا ہی بچانے کی کوشش کرے وہ بہر حال اس کے پرتو سے اپنے آپ کو یکسر محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے اُس کی آراء، اس کے افکار و نظریات، اُس کے احساسات و جذبات، اُس کے ذاتی میلان و رجحان کے مختلف عکس ہوتے ہیں۔ آخر یہ بات کسی انسان کیلئے کس طرح ممکن ہے کہ وہ دنیا میں ایک خاص طرزِ فکر اور خاص جذبہ و احساس کے ساتھ زندہ ہو مگر اس طرزِ فکر اور اس جذبۂ احساس کی جن عوامل نے تشکیل کی ہے ان کے اثرات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھ سکے۔ اُس کی خاندانی اور نسلی خصوصیات اس کی سیرت کی تعمیر کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ ماحول کے تقاضے اس بنیاد پر کردار کی مضبوط عمارت اٹھاتے ہیں۔ زندگی کے تلخ و شیریں تجربات جو اسے اپنے ماحول کی تجربہ گاہ سے حاصل ہوتے ہیں اس کے کردار کی عمارت کو مختلف رنگوں سے مزیّن کرتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کی اسی عمارت میں، جس کے کچھ حصّوں کی تعمیر اُس کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور کچھ حصّے اُسے جُوں کے توں دوسروں سے منتقل ہو جاتے ہیں، زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس سے اُسے کسی طرح بھی مفر نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اُن اثرات سے جو اُس کے خون میں سرایت کیے ہوتے ہیں کسی طرح بھی بچا نہیں سکتا۔ وہ اپنے قلب و نگاہ کو خواہش اور تمنّا کے باوجود اس ماحول کی پرچھائیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا جس کی آغوش میں اُس نے پرورش پائی ہے۔ اس بنا پر اس کی رائے، اس کے ذاتی رجحانات اور تعصبات کی آمیزش سے کبھی خالی نہیں ہو سکتی۔ وہ جب کبھی سوچے گا اپنے ذاتی، قومی اور ملکی مفادات کو سامنے رکھ کر سوچے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کے جانبدارانہ طرزِ فکر میں وہ بے لوثی کبھی نہیں آ سکتی جو حق و صداقت کے تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کر سکے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان حیران و ششدر ہو کر پوچھتا ہے کہ وہ حق کو کہاں سے حاصل کرے۔ اس کا جواب بالکل سیدھا اور واضح ہے کہ یہ حق اُسی ذات بے ہمتا سے مل سکتا ہے جو زمان و مکان کی حدود و قیود سے یکسر آزاد ہے، جو کسی خاص ماحول یا عہد کی پیداوار نہیں، بلکہ یہ ماحول اور عہد اور یہ زمان و مکان اپنے وجود کے لیے سراسر اُس ذات کے رہینِ منت ہیں جو ازلی اور ابدی اور قائم بالذات ہے، جسے نہ کسی نے جنم دے کر اپنی نسلی خصوصیات اُس کی طرف منتقل کی ہیں اور نہ خود اس نے کسی دوسرے کو جنم دے کر اپنی الوہیت کا وارث بنایا ہے۔ بے لاگ ذات اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی اس لیے حق کا واحد سرچشمہ صرف باری تعالیٰ ہے اور انسان خالص امرِ حق صرف اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو کر اُس ہدایت کی پابندی قبول کرے جو باری تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے۔

پھر اسی معاملہ کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھیے۔ انسان اگر اپنے لیے کوئی صحیح اور مکمل ضابطۂ اخلاق مرتب کر سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ وہ اپنی زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو پوری طرح جاننے اور سمجھنے میں کامیاب ہو چکا ہو۔ کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ جو چیز خود نہایت ہی پیچیدہ مخلوق ہو اور جس کی نگاہوں سے اُس کی اپنی ذات کے ہزارہا پہلو مخفی اور پوشیدہ ہوں وہ اپنی پوری شخصیت کا اچھی طرح ادراک کیے بغیر اپنے لیے کوئی متوازن ضابطۂ حیات تشکیل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ انسان چند دھاتوں کا مجموعہ ہی نہیں، جن کا تجزیہ کر کے ان کی ترتیب کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ وہ شعور، آگہی، جذبہ و احساس اور نہ جانے کتنی غیر مرئی صفات کا حامل ہے۔ انسان ابھی تک اپنے شعور کی وسعتوں کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا۔ لاشعور کا ایک بحرِ بیکراں جو اُس کی شخصیت پر ہر لحظہ اثر انداز ہوتا ہے وہ اُس کی نظروں سے قریب قریب اوجھل ہے۔ اس کی نگاہوں نے اگر شعور کی یخ بستہ چٹانوں کو چیر کر کبھی لاشعور کے تلاطم خیز سمندر تک پہنچنے کی کوشش کی بھی تو وہ صرف اس کی سطح پر چند بکھری ہوئی اور منتشر لہروں میں الجھ کر رہ گئیں۔ اور

اس سمندر کی اُن اتھاہ گہرائیوں کا اندازہ کرنے میں یکسر ناکام رہیں جس کی تند و تیز رویں اور بلاخیز موجیں ہمارے سفینۂ حیات کو ہمیشہ متزلزل رکھتی ہیں۔ یہ تو صرف شعور اور لاشعور کا معاملہ ہے۔ حیاتِ انسانی کے ہزاروں نہیں لاکھوں گوشے اسی طرح انسانی عقل و فکر کی رسائی سے ماوراء ہیں۔ بالفرض اگر کبھی انسان شعور اور لاشعور کا ادراک کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو پھر بھی اس کے لیے کسی صحیح ضابطۂ حیات کی ترتیب ممکن نہ ہو گی۔ پھر اُس کے لیے یہ سوال درپیش ہو گا کہ وہ ان کے درمیان کس انداز سے تطابق و توافق پیدا کرے کہ اُس کی زندگی روحانی، عقلی اور جذباتی اعتبار سے نہ صرف متوازن اور ہم آہنگ ہو بلکہ ہر لحاظ سے مکمل بھی ہو۔ اس ذمہ داری کو عقل تو بہرحال اٹھانے سے قاصر ہے۔ عقل تجربات کے بل بوتے پر آگے بڑھتی ہے۔ تجربات کا میدان صرف مادی دنیا ہی ہے۔ ان کی مدد سے ہم اُن اخلاقی اور روحانی عناصر کا صحیح کھوج نہیں لگا سکتے جن کے بغیر ہماری زندگی کائنات کی وسعتوں میں یکسر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خبیر و علیم ذات ہی ہے جو ہماری زندگی کے ہر گوشے پر پوری پوری نگاہ رکھتی ہے، جو اُس کی نوعیت کو اچھی طرح جانتی ہے اور اُس کے تقاضوں کو بالکل ٹھیک طور سے سمجھتی ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان تعلق، انسان اور کائنات کے درمیان تعلق اور انسان اور اُس کے خالق کے درمیان تعلق کی صحیح انداز پر تشکیل وہی کر سکتی ہے۔ جس طرح ایک مشین ساز ہی اپنی مشین کے سارے پرزوں کی ماہیت اور اُن کی صحیح کارکردگی کو اچھی طرح جانتا ہے، اسی طرح کائنات کا خالق ہی اس بات کا صحیح فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُس کی مخلوق اس دنیا میں کس انداز سے زندگی بسر کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ : خبردار! اُس کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔

یعنی خدا صرف ہمارا خالق اور مالک ہی نہیں بلکہ ہمارا حکمراں اور قانون ساز بھی ہے۔ اس نے جہاں ہماری تخلیق کا انتظام فرمایا ہے وہاں ہمیں اس ضابطۂ حیات سے بھی نوازا ہے جس کے مطابق ہم دنیا میں حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کر کے دنیا اور آخرت میں کامیاب

کامران ہو سکیں یہ مخلوق کی انتہائی احسان فراموشی بلکہ ضلالت اور ہلاکت ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے تو اللہ تعالیٰ کے دستِ کرم کی رہینِ منت ہو مگر عمل کے میدان میں اس کے عطا کردہ ضابطۂ حیات سے صرفِ نظر کر کے اپنے اوہامِ باطل کی پیروی شروع کر دے۔

یہ ہے جماعت اسلامی کا اصل پیغام اور اس کی دعوت کا صحیح خلاصہ۔ یہ بات ہم کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے۔ یہ وہ بدیہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے بار بار انسانوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ یہ وہ دعوت ہے جسے پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل کیں۔ یہ وہ پیغام ہے جسے سننے کی معبودانِ باطل کبھی تاب نہیں لا سکے۔ یہ وہ نعرۂ حق ہے جس کے بلند ہوتے ہی کفر کے ایوانوں میں زلزلہ آجاتا ہے۔ کفر و الحاد خواہ اس پر کتنا ہی برہم ہو مگر انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ انسان اپنے خالق اور مالک کو پہچان کر اس کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ وہ ضابطہ جو ہر عیب سے پاک اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے محفوظ ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان کی نئی مجلسِ شوریٰ کا جو پہلا اجتماع دسمبر کے دوسرے ہفتے لاہور میں منعقد ہوا اُس میں جو مختلف قراردادیں منظور کی گئیں وہ ملک کی تازہ صورتِ حال کے تجزیہ، سیاسی سماجی اور دینی تنظیموں کی نازک ذمہ داریوں اور حکومت کے لائحۂ عمل کو صحیح رُخ پر متعین کرنے کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ہم ان صفحات میں ساری قراردادوں پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف ایک قرارداد کو اُس کی غیر معمولی اہمیت اور حکومت کو اس نازک اور اہم مسئلہ پر فوری طور پر متوجہ کرنے کے لیے اُسے یہاں درج کرتے ہیں:

"حال میں حکومت کی طرف سے حج کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کی رائے میں وہ نہایت نامناسب ہے اور اس پر فوراً نظرِ ثانی کی جانی چاہیے۔ پچھلی جنگ میں اللہ تعالیٰ نے ہماری قوم پر جو فضل و کرم فرمایا ہے اس کا یہ کوئی صحیح شکر نہیں کہ اسی سال ہم ایک عظیم دینی فریضے

پر پابندیاں عائد کر کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اس کے دربار میں حاضری سے روک دیں۔ دینی فرائض میں رکاوٹیں عائد کرنا اوّل تو یوں ہی خود ہی ایک مسلم حکومت کے لیے سخت نازیبا ہے، لیکن اس سال تو خصوصیت کے ساتھ ضرورت تھی کہ پاکستان کے مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں بیت اللہ کی زیارت کے لیے جا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے اور اس کے ساتھ دنیا کے گوشے گوشے سے آنے والے مسلمانوں کو ان حالات سے بھی آگاہ کرتے جو پاکستان اور کشمیر میں کفار ہند کی چیرہ دستیوں سے رونما ہوئے ہیں۔ محض زرمبادلہ بچانے کی خاطر اس معاملہ میں تنگ دلی سے کام لینا درست نہیں ہے۔ مصارفِ حج کے سلسلے میں مجموعی طور پر جو زرمبادلہ خرچ ہوتا ہے وہ ہمارے کل زرمبادلہ کا مشکل ڈیڑھ فیصد حصہ ہے۔ اس خرچ کو کم کرنے کی بجائے ہمیں زرمبادلہ کے دوسرے ایسے مصارف میں کمی کرنی چاہیے جو یا تو غیر ضروری ہیں یا اپنی اہمیت میں مصارفِ حج سے کم تر ہیں۔

علاوہ بریں اس پالیسی میں ۵۰ سال سے کم عمر کے لوگوں کو حج کی اجازت دینے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے غیر معقول ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی خاندان کے جو افراد مل کر حج کرنا چاہتے ہیں ان میں سے بعض مقررہ عمر سے کم ہونے کے باعث اپنے معمر رشتہ داروں کے ساتھ نہ جا سکیں گے۔ حتیٰ کہ ایک بیوی اپنے شوہر کے ساتھ، اور ایک ماں اپنے بیٹے کے ساتھ سفر نہ کر سکنے کی وجہ سے فریضۂ حج ہی سے محروم ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پابندی بے سوچے سمجھے عائد کر دی گئی ہے اور اس کے نتائج پر قطعی غور نہیں کیا گیا ہے۔"

یہ قرارداد ہر لحاظ سے جامع ہے اور اس میں وہ سارے پہلو آ گئے ہیں جن پر حکومت کو جلد از جلد غور کرنا چاہیے۔ حج اسلام کا ایک بنیادی فریضہ ہے، اور ایک مسلم حکومت کو اس فریضہ کی ادائیگی میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ آسانیاں بہم پہنچانی چاہییں۔ یہ ناروا پابندیاں (باقی ص ۴۱ پر)

تفہیم القرآن

الفتح

نام | پہلی ہی آیت کے الفاظ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِيْنًا سے ماخوذ ہے۔ یہ محض اس سورۃ کا نام ہی نہیں ہے بلکہ مضمون کے لحاظ سے بھی اس کا عنوان ہے، کیونکہ اس میں اُس فتحِ عظیم پر کلام کیا گیا ہے جو صلح حدیبیہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور مسلمانوں کو عطا فرمائی تھی۔

زمانۂ نزول | روایات اس پر متفق ہیں کہ اس کا نزول ذی القعدہ سنہ ۶ھ میں اُس وقت ہوا تھا جب آپ کفارِ مکہ سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ کرنے کے بعد مدینۂ منورہ کی طرف واپس تشریف لے جا رہے تھے۔

تاریخی پس منظر | جن واقعات کے سلسلے میں یہ سورت نازل ہوئی ان کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکۂ معظمہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں عمرہ ادا فرمایا ہے۔ پیغمبر کا خواب ظاہر ہے کہ محض خواب و خیال نہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، اور آگے چل کر آیت ۲۷ میں اللہ تعالیٰ نے خود توثیق کر دی ہے کہ یہ خواب ہم نے اپنے رسول کو دکھایا تھا۔ اس لیے درحقیقت یہ نرا خواب نہ تھا بلکہ ایک الٰہی اشارہ تھا جس کی پیروی کرنا حضور کے لیے ضروری تھا۔

بظاہر اسباب اِس ہدایت پر عمل کرنے کی کوئی صورت ممکن نظر نہ آتی تھی۔ کفارِ قریش نے ۶ سال سے مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا اور اس پوری مدت میں

کسی مسلمان کو انہوں نے حج اور عمرے تک کے لیے حدودِ حرم کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا۔
اب آخر یہ کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کی ایک جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے دیں گے۔ عمرے کا احرام باندھ کر جنگی ساز و سامان ساتھ لیے ہوئے نکلنا گویا خود لڑائی کو دعوت دینا تھا، اور غیر مسلح جانے کے معنی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالنے کے تھے۔ اِن حالات میں کوئی شخص یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اِس اشارے پر عمل کیا جائے تو کیسے۔
مگر پیغمبر کا منصب یہ تھا کہ اُس کا رب جو حکم بھی اس کو دے وہ بے کھٹکے اس پر عمل کر گزرے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تامّل اپنا خواب صحابۂ کرام کو سُنا کر سفر کی تیاری شروع کردی۔ آس پاس کے قبائل میں بھی آپ نے اعلانِ عام کرادیا کہ ہم عمرے کے لیے جارہے ہیں، جو ہمارے ساتھ چلنا چاہے وہ آجائے۔ جن لوگوں کی نگاہ ظاہری اسباب پر تھی انہوں نے سمجھا کہ یہ لوگ موت کے مُنہ میں جا رہے ہیں۔ اُن میں سے کوئی آپ کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مگر جو اللہ اور اس کے رسول پر سچا ایمان رکھتے تھے انہیں اس امر کی کوئی پروا نہ تھی کہ انجام کیا ہوگا۔ ان کے لیے بس یہ کافی تھا کہ اللہ کا اشارہ ہے اور اس کا رسول تعمیلِ حکم کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد کوئی چیز ان کو رسولِ خدا کا ساتھ دینے سے نہ روک سکتی تھی۔ ۱۴۰۰ صحابی حضورؐ کی معیت میں اس نہایت خطرناک سفر پر جانے کے لیے تیار ہوگئے۔
ذی القعدہ ۶ھ کے آغاز میں یہ مبارک قافلہ مدینہ سے روانہ ہوا۔ ذوالحلیفہ[۱] پہنچ کر سب نے عمرے کا احرام باندھا۔ قربانی کے لیے ۷۰ اونٹ ساتھ لیے جن کی گردنوں میں ھَدْی کی علامت کے طور پر قلادے پڑے ہوئے تھے۔ پرتلوں میں صرف ایک ایک

---

[۱] یہ مقام مدینہ سے مکے کی جانب تقریباً ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اب اسے بئرِ علی کہتے ہیں، اور مدینہ کے حاجی اسی مقام سے حج اور عمرے کا احرام باندھتے ہیں۔

تلوار رکھ لی جس کی تمام زائرینِ حرم کو عرب کے معروف قاعدے کے مطابق اجازت تھی، اور اس کے سوا کوئی سامانِ جنگ ساتھ نہ لیا۔ اس طرح یہ قافلہ لبّیک لبّیک کی صدائیں بلند کرتا ہوا بیت اللہ کی طرف چل پڑا۔

اُس وقت مکّہ اور مدینے کے تعلقات کی جو نوعیت تھی، عرب کا بچّہ بچّہ اس کو جانتا تھا۔ ابھی پچھلے سال ہی تو شوال ۵ھ میں قریش نے قبائلِ عرب کی متحدہ طاقت کے ساتھ مدینے پر چڑھائی کی تھی اور غزوۂ احزاب کا مشہور معرکہ پیش آچکا تھا۔ اس لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے بڑے قافلے کے ساتھ اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو پورے عرب کی نگاہیں اِس عجیب سفر کی طرف مرکوز ہو گئیں، اور لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ قافلہ لڑنے کے لیے نہیں جا رہا ہے بلکہ ماہ حرام میں، احرام باندھ کر، ھَدْی کے اونٹ ساتھ لیے ہوئے بیت اللہ کا طواف کرنے جا رہا ہے اور قطعی طور پر غیر مسلح ہے۔

قریش کے لوگوں کو حضورؐ کے اِس اقدام نے سخت پریشانی میں ڈال دیا۔ ذی القعدہ کا مہینہ اُن حرام مہینوں میں سے تھا جو صدہا برس سے عرب میں حج و زیارت کے لیے محترم سمجھے جاتے تھے۔ اِس مہینے میں جو قافلہ احرام باندھ کر حج یا عمرے کے لیے جا رہا ہو اسے روکنے کا کسی کو حق نہ تھا، حتیٰ کہ کسی قبیلے سے اُس کی دشمنی بھی ہو تو عرب کے مسلّمہ قوانین کی رُو سے وہ اپنے علاقے سے اُس کے گزرنے میں مانع نہ ہو سکتا تھا۔ قریش کے لوگ اِس اُلجھن میں پڑ گئے کہ اگر ہم مدینے کے اِس قافلے پر حملہ کر کے اسے مکّۂ معظمہ میں داخل ہونے سے روکتے ہیں تو پورے ملک میں اس پر شور مچ جائے گا، عرب کا ہر شخص پکار اُٹھے گا کہ یہ سراسر زیادتی ہے، تمام قبائلِ عرب یہ سمجھیں گے کہ ہم خانۂ کعبہ کے مالک بن بیٹھے ہیں، ہر قبیلہ اس تشویش میں مبتلا ہو جائے گا کہ آئندہ کسی کو حج اور عمرہ کرنے دینا یا نہ کرنے دینا اب ہماری مرضی پر موقوف ہے، جس سے بھی ہم ناراض ہوں گے اسے بیت اللہ کی زیارت کرنے سے اسی طرح روک دیں گے

جس طرح آج مدینے کے اِن زائرین کو روک رہے ہیں۔ یہ ایسی غلطی ہوگی جس سے سارا رعب ہم سے منحرف ہوجائے گا۔ لیکن اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنے بڑے قافلے کے ساتھ بخیریت اپنے شہر میں داخل ہوجانے دیتے ہیں تو پورے ملک میں ہماری ہوا اکھڑ جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ ہم محمدؐ سے مرعوب ہوگئے۔ آخرکار بڑی کشمکش و پیچ کے بعد اُن کی جاہلانہ حمیّت ہی اُن پر غالب آکر رہی اور انہوں نے اپنی ناک کی خاطر یہ فیصلہ کرلیا کہ کسی قیمت پر بھی اس قافلے کو اپنے شہر میں داخل نہیں ہونے دینا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی کعب کے ایک شخص کو مخبر کی حیثیت سے آگے بھیج رکھا تھا تاکہ وہ قریش کے ارادوں اور ان کی نقل و حرکت سے آپ کو بروقت مطلع کرتا رہے۔ جب آپ عُسفان[1] پہنچے تو اُس نے آکر آپ کو اطلاع دی کہ قریش کے لوگ پوری تیاری کے ساتھ ذی طُویٰ[2] کے مقام پر پہنچ گئے ہیں اور خالد بن ولید کو انہوں نے دو سو سواروں کے ساتھ کُراع الغمیم[3] کی طرف آگے بھیج دیا ہے تاکہ وہ آپ کا راستہ روکیں۔ قریش کی چال یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح آنحضرتؐ کے ساتھیوں سے چھیڑ چھاڑ کرکے اُن کو اشتعال دلائیں، اور پھر اگر لڑائی ہوجائے تو پورے ملک میں یہ مشہور کردیں کہ یہ لوگ دراصل آئے تھے لڑنے کے لیے، مگر یہاں انہوں نے عمرے کا کیا تھا اور احرام محض دھوکہ دینے کے لیے باندھ رکھا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع پاتے ہی فوراً راستہ بدل دیا اور ایک نہایت دشوار گزار راستہ سے سخت مشقت اٹھا کر حُدَیبیہ[4] کے مقام پر پہنچ گئے جو عین حَرَم کی سرحد پر واقع

---

[1] یہ مقام مدینہ سے مکہ کے راستہ پر، مکہ سے تقریباً دو دن کی مسافت پر واقع ہے (یعنی اونٹ کی سواری پہ یہاں سے مکہ پہنچنے میں دو دن لگتے ہیں)۔

[2] مکہ سے باہر عُسفان کے راستہ پر ایک مقام۔

[3] عُسفان سے آٹھ میل کے فاصلے پر، مکہ کی جانب۔ [4] یہ مقام جدہ سے مکہ جانے والی ٹرک پر ٹھیک اُس جگہ واقع ہے جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتی ہیں۔ اب اسے شُمَیسی کہتے ہیں۔ مکہ سے اس کا فاصلہ تقریباً ۱۳ میل ہے۔

تھا۔ یہاں بنی خزاعہ کا سردار بُدَیل بن وَرْقاء اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کے ساتھ آپؐ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ کس غرض کے لیے آئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے، صرف بیت اللہ کی زیارت اور اس کا طواف ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہی بات ان لوگوں نے جاکر قریش کے سرداروں کو بتادی اور ان کو مشورہ دیا کہ وہ ان زائرینِ حرم کا راستہ نہ روکیں۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے اور انہوں نے اَحابیش[1] کے سردار حُلَیس بن علقمہ کو حضورؐ کے پاس بھیجا تاکہ وہ آپ کو واپس جانے پر آمادہ کرے۔ سردارانِ قریش کا مقصد یہ تھا کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بات نہ مانیں گے تو وہ ان سے ناراض ہوکر پلٹے گا اور پھر احابیش کی پوری طاقت ہمارے ساتھ ہوگی۔ مگر جب اس نے آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سارا قافلہ احرام بند ہے، ہدی کے اونٹ سامنے کھڑے ہیں جن کی گردنوں میں قلادے پڑے ہوئے ہیں، اور یہ لوگ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے آئے ہیں تو وہ حضورؐ سے کوئی بات کیے بغیر مکّہ کی طرف پلٹ گیا اور اس نے جاکر قریش کے سرداروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ لوگ بیت اللہ کی عظمت مان کر اس کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ اگر تم ان کو روکو گے تو احابیش اس کام میں تمہارا ساتھ ہرگز نہ دیں گے۔ ہم تمہارے حلیف اس لیے نہیں بنے ہیں کہ تم حرمتوں کو پامال کرو اور ہم اس میں تمہاری حمایت کریں۔

پھر قریش کی طرف سے عُروہ بن مسعود ثقفی آیا اور اس نے اپنے نزدیک بڑی اونچ نیچ سمجھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ آپ مکّہ میں داخل ہونے کے ارادے سے باز آجائیں، مگر آپ نے اس کو بھی وہی جواب دیا جو بنی خُزاعہ کے سردار کو دیا تھا کہ ہم لڑائی کے ارادے سے نہیں آئے ہیں بلکہ بیت اللہ کی تعظیم کرنے والے بن کر ایک دینی فریضہ بجالانے کے لیے آئے ہیں۔ واپس جاکر عُروہ نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں، مگر خدا کی قسم، میں نے اصحابِ محمدؐ کو جس طرح محمد

[1] یہ اطرافِ مکّہ میں رہنے والے چند قبائل کا مجموعہ تھا جس سے قریش کے حلیفانہ تعلقات تھے۔

(صلی اللہ علیہ وسلم) کا فدائی دیکھا ہے ایسا منظر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں دیکھا۔ ان لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ محمدؐ وضو کرتے ہیں تو ان کے اصحاب پانی کا ایک قطرہ تک زمین پر نہیں گرنے دیتے اور سب اپنے جسم اور کپڑوں پر مل لیتے ہیں۔ اب تم لوگ سوچ لو کہ تمہارا مقابلہ کس سے ہے۔

اس دوران میں جبکہ ایلچیوں کی آمد و رفت اور گفت و شنید کا یہ سلسلہ جاری تھا، قریش کے لوگ بار بار یہ کوشش کرتے رہے کہ چپکے سے حضورؐ کے کیمپ پر چھاپے مار کر صحابہؓ کو اشتعال دلائیں اور کسی نہ کسی طرح ان سے کوئی ایسا اقدام کرالیں جس سے لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے مگر ہر مرتبہ صحابہ کے صبر و ضبط اور حضورؐ کی حکمت و فراست نے ان کی ساری تدبیروں کو ناکام کر دیا۔ ایک دفعہ ان کے چالیس پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور مسلمانوں کے پڑاؤ پر پتھر اور تیر برسانے لگے۔ صحابہ نے ان سب کو گرفتار کر کے حضورؐ کے سامنے پیش کر دیا، مگر آپؐ نے ان سب کو چھوڑ دیا۔ ایک اور موقع پر تنعیم[1] کی طرف سے ۸۰ آدمی عین نمازِ فجر کے وقت آئے اور انہوں نے اچانک چھاپہ مار دیا۔ یہ لوگ بھی پکڑے گئے، مگر حضورؐ نے انہیں بھی رہا کر دیا۔ اس طرح قریش کو اپنی ہر چال اور ہر تدبیر میں ناکامی ہوتی چلی گئی۔

آخرکار حضورؐ نے خود اپنی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایلچی بنا کر مکہ بھیجا اور ان کے ذریعہ سے سردارانِ قریش کو یہ پیغام دیا کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ زیارت کے لیے ہدی ساتھ لے کر آئے ہیں، طواف اور قربانی کر کے واپس چلے جائیں گے۔ مگر وہ لوگ نہ مانے اور حضرت عثمانؓ کو مکہ ہی میں روک لیا۔ اس دوران میں یہ خبر اُڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے ہیں، اور ان کے واپس نہ آنے سے مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ یہ خبر سچی ہے۔ اب مزید تحمل کا کوئی موقع نہ تھا۔ مکہ میں داخلہ کی بات تو دوسری تھی، اس کے لیے طاقت

---

[1] یہ مکہ کے قریب حدودِ حرم سے باہر ایک مقام ہے۔ مکہ کے لوگ بالعموم عمرہ کرنے کی خاطر اسی مقام پر جا کر احرام باندھتے ہیں اور پھر واپس آکر عمرہ ادا کرتے ہیں۔

کا استعمال ہرگز پیشِ نظر نہ تھا۔ مگر جب نوبت سفیر کے قتل تک پہنچ گئی تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے اس بات پر بیعت لی کہ اب یہاں سے ہم مرتے دم تک پیچھے نہ ہٹیں گے۔ موقع کی نزاکت نگاہ میں ہو تو آدمی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی معمولی بیعت نہ تھی۔ مسلمان صرف ۱۴ سو تھے اور کسی سامانِ جنگ کے بغیر آئے تھے۔ اپنے مرکز سے ڈھائی سو میل دُور، عین مکہ کی سرحد پر ٹھیرے ہوئے تھے جہاں دشمن اپنی پُوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو سکتا تھا اور گرد و پیش سے اپنے حامی قبیلوں کو لا کر بھی انہیں گھیرے میں لے سکتا تھا۔ اس کے باوجود ایک شخص کے سوا پورا قافلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ پر مرنے مارنے کی بیعت کرنے کے لیے بلا تامل آمادہ ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے اخلاص ایمانی اور راہِ خدا میں ان کی فدائیت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ یہی وہ بیعت ہے جو بیعتِ رضوان کے نام سے تاریخِ اسلام میں مشہور ہے

بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضؓ کے قتل کی خبر غلط تھی۔ حضرت عثمان خود بھی واپس آگئے اور قریش کی طرف سے سُہیل بن عَمرو کی قیادت میں ایک وفد بھی صلح کی بات چیت کرنے کے لیے حضورؐ کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ اب قریش اپنی اِس ضد سے ہٹ گئے تھے کہ وہ حضورؐ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سرے سے مکہ میں داخل ہی نہ ہونے دیں گے۔ البتہ اپنی ناک بچانے کے لیے ان کو صرف یہ اصرار تھا کہ آپ اِس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آپ عمرہ کے لیے آسکتے ہیں۔ طویل گفت و شنید کے بعد جن شرائط پر صلح نامہ لکھا گیا وہ یہ تھیں:

(۱) دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی، اور ایک دوسرے کے خلاف خفیہ یا علانیہ کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔

(۲) اس دوران میں قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ کر محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کے پاس جائے گا اسے آپ واپس کر دیں گے، اور آپ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس چلا جائے گا اسے وہ واپس نہ کریں گے۔

(۳) قبائلِ عرب میں سے جو قبیلہ بھی فریقین میں سے کسی ایک کا حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہونا چاہے گا اُسے اس کا اختیار ہوگا۔

(۴) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِس سال واپس جائیں گے اور آئندہ سال وہ عمرے کے لیے آکر تین دن مکہ میں ٹھیر سکتے ہیں، بشرطیکہ پرتلوں میں صرف ایک ایک تلوار لے کر آئیں اور کوئی سامانِ حرب ساتھ نہ لائیں۔ ان تین دنوں میں اہلِ مکّہ اُن کے لیے شہر خالی کر دیں گے (تاکہ کسی تصادم کی نوبت نہ آئے)۔ مگر واپس جاتے ہوئے وہ یہاں کے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز نہ ہونگے۔

جس وقت اس معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں، مسلمانوں کا پورا لشکر سخت مضطرب تھا۔ کوئی شخص بھی اُن مصلحتوں کو نہیں سمجھ رہا تھا جنہیں نگاہ میں رکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ شرائط قبول فرما رہے تھے۔ کسی کی نظر اتنی دُور رس نہ تھی کہ اس صلح کے نتیجے میں جو خیرِ عظیم رونما ہونے والی تھی اسے دیکھ سکے۔ کفارِ قریش اسے اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے اور مسلمان اِس پر بے تاب تھے کہ ہم آخر دب کر یہ ذلیل شرائط کیوں قبول کریں۔ حضرت عمرؓ جیسے بالغ النظر مدبّر تک کا یہ حال تھا کہ وہ کہتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد کبھی میرے دل میں شک نے راہ نہ پائی تھی، مگر اس موقع پر میں بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ بے چین ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہا "کیا حضور اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا یہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ پھر آخر ہم اپنے دین کے معاملہ میں یہ ذلت کیوں اختیار کریں؟" انہوں نے جواب دیا "اے عمرؓ، وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ ان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔" پھر ان سے صبر نہ ہوا۔ جا کر یہی سوالات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کیے اور حضورؐ نے بھی ان کو ویسا ہی جواب دیا جیسا حضرت ابوبکرؓ نے دیا

احرام:

تھا۔ بعد میں حضرت عمرؓ مدتوں اس پر نوافل اور صدقات ادا کرتے رہے تاکہ اللہ تعالےٰ اس گستاخی کو معاف فرما دے جو اس روز اُن سے شانِ رسالت میں ہوگئی تھی۔

سب سے زیادہ دو باتیں اس معاہدے میں لوگوں کو بُری طرح کھل رہی تھیں۔ ایک شرط نمبر ۲، جس کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ یہ صریح نامساوی شرط ہے، اگر مکہ سے بھاگ کر آنے والوں کو ہم واپس کریں تو مدینہ سے بھاگ کر جانے والے کو وہ کیوں نہ واپس کریں؟ حضورؐ نے اس پر فرمایا جو ہمارے ہاں سے بھاگ کر ان کے پاس چلا جائے وہ آخر ہمارے کس کام کا ہے؟ اللہ اسے ہم سے دُور ہی رکھے۔ اور جو ان کے ہاں سے بھاگ کر ہمارے پاس آجائے اسے اگر ہم واپس کر دینگے تو اللہ اس کے لیے خلاصی کی کوئی اور صورت پیدا فرما دے گا۔ دوسری چیز جو لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی وہ چوتھی شرط تھی۔ مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ تمام عرب کے سامنے گویا ہم ناکام واپس جارہے ہیں۔ مزید براں یہ سوال بھی دلوں میں خلش پیدا کر رہا تھا کہ حضورؐ نے تو خواب میں یہ دیکھا تھا کہ ہم مکہ میں طواف کر رہے ہیں، مگر یہاں تو ہم طواف کیے بغیر واپس جانے کی شرط مان رہے ہیں۔ حضورؐ نے اس پر لوگوں کو سمجھایا کہ خواب میں آخر اسی سال طواف کرنے کی صراحت تو نہ تھی۔ شرائطِ صلح کے مطابق اس سال نہیں تو اگلے سال انشاء اللہ طواف ہوگا۔

جلتی پر تیل کا کام جس واقعہ نے کیا وہ یہ تھا کہ عین اُس وقت جب صلح کا معاہدہ لکھا جارہا تھا، سُہیل بن عَمرو کے اپنے صاحبزادے ابو جَندَل، جو مسلمان ہو چکے تھے اور کفارِ مکہ نے ان کو قید کر رکھا تھا، کسی نہ کسی طرح بھاگ کر حضورؐ کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے فریاد کی کہ مجھے اِس حبسِ بے جا سے نجات دلائی جائے۔ صحابہ کرام کے لیے یہ حالت دیکھ کر ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ مگر سُہیل بن عمرو نے کہا کہ صلح نامے کی تحریر چاہے مکمل نہ ہوئی

ہو، شرائط تو ہمارے اور آپ کے درمیان طے ہو چکی ہیں، اس لیے اس لڑکے کو میرے حوالے کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حجت تسلیم فرمالی اور ابوجندل ظالموں کے حوالہ کر دیے گئے۔

صلح سے فارغ ہو کر حضورؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ اب یہیں قربانی کر کے سر منڈواؤ اور احرام ختم کر دو۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ حضورؐ نے تین مرتبہ حکم دیا، مگر صحابہ پر اس وقت رنج و غم اور دل شکستگی کا ایسا شدید غلبہ تھا کہ انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ حضورؐ کے پورے دور رسالت میں اس ایک موقع کے سوا کبھی یہ صورت پیش نہیں آئی کہ آپ صحابہ کو حکم دیں اور وہ اس کی تعمیل کے لیے دوڑ نہ پڑیں۔ حضورؐ کو اس پر سخت صدمہ ہوا اور آپ نے اپنے خیمے میں جا کر ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے اپنی کبیدہ خاطری کا اظہار فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ بس خاموشی کے ساتھ تشریف لے جا کر خود اپنا اونٹ ذبح فرمائیں اور حجام کو بلا کر اپنا سر منڈوا لیں۔ اس کے بعد لوگ خود بخود آپ کے عمل کی پیروی کریں گے اور سمجھ لیں گے کہ جو فیصلہ ہو چکا ہے وہ اب بدلنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ کے فعل کو دیکھ کر لوگوں نے بھی قربانیاں کر لیں، سر منڈوا لیے یا بال ترشوا لیے اور احرام سے نکل آئے۔ مگر دل اُن کے غم سے کٹے جا رہے تھے۔

اس کے بعد جب یہ قافلہ حدیبیہ کی صلح کو اپنی شکست اور ذلت سمجھتا ہوا مدینہ کی طرف واپس جا رہا تھا، اُس وقت ضَجْنَان[1] کے مقام پر (یا بقول بعض کُراع الغَمِیم کے مقام پر) یہ سورۃ نازل ہوئی جس نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ صلح جس کو وہ شکست سمجھ رہے ہیں، دراصل فتح عظیم ہے۔ اس کے نازل ہونے کے بعد حضورؐ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا آج مجھ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے جو میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔ پھر یہ سورۃ آپ نے تلاوت فرمائی اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کو بلا کر اسے سنایا کیونکہ وہ سب سے زیادہ

[1] مکہ سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلہ پر ایک مقام

رنجیدہ تھے۔

اگرچہ اہلِ ایمان تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سُن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے، مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس صلح کے فوائد ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے یہاں تک کہ کسی کو بھی اس امر میں شک نہ رہا کہ فی الواقع یہ صلح ایک عظیم الشان فتح تھی

ا۔ اس میں پہلی مرتبہ عرب میں اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کیا گیا۔ اس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے ساتھیوں کی حیثیت محض قریش اور قبائلِ عرب کے خلاف خروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی اور وہ ان کو برادری باہر (OUT LAW) سمجھتے تھے۔ اب خود قریش ہی نے آپ سے معاہدہ کر کے سلطنتِ اسلامی کے مقبوضات پر آپ کا اقتدار مان لیا اور قبائلِ عرب کے لیے یہ دروازہ بھی کھول دیا کہ اِن دونوں سیاسی طاقتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدات کر لیں۔

۲۔ مسلمانوں کے لیے زیارت بیت اللہ کا حق تسلیم کر کے قریش نے آپ سے آپ گویا یہ بھی مان لیا کہ اسلام کوئی بے دینی نہیں ہے، جیسا کہ وہ اب تک کہتے چلے آرہے تھے، بلکہ عرب کے مسلّمہ ادیان میں سے ایک ہے اور دوسرے عربوں کی طرح اس کے پیرو بھی حج و عمرہ کے مناسک ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اِس سے اہلِ عرب کے دلوں کی وہ نفرت کم ہو گئی جو قریش کے پروپیگنڈا سے اسلام کے خلاف پیدا ہو گئی تھی۔

۳۔ دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جانے سے مسلمانوں کو امن میسّر آگیا اور انہوں نے عرب کے تمام اطراف و نواح میں پھیل کر اس تیزی سے اسلام کی اشاعت کی کہ صلح حُدَیبیہ سے پہلے پورے ۱۹ سال میں اُتنے آدمی مسلمان نہ ہوئے تھے جتنے اس کے بعد دو سال کے اندر ہو گئے۔ یہ اسی صلح کی برکت تھی کہ یا تو وہ وقت تھا جب حُدَیبیہ کے موقع پر حضورؐ کے ساتھ صرف ۱۴ سو آدمی آئے تھے، یا دو ہی سال کے بعد جب قریش کی عہد شکنی کے نتیجے میں حضورؐ

نے مکہ پر چڑھائی کی تو دس ہزار کا لشکر آپ کے ہمرکاب تھا۔

۴۔ قریش کی طرف سے جنگ بند ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع مل گیا کہ اپنے مقبوضات میں اسلامی حکومت کو اچھی طرح مستحکم کر لیں اور اسلامی قانون کے اجراء سے مسلم معاشرے کو ایک مکمل تہذیب و تمدن بنا دیں۔ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں فرمایا کہ "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔" (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، صفحات ۴۳۴ تا ۴۳۶ و ۴۴۳ تا ۴۴۴)

۵۔ قریش سے صلح کے بعد جنوب کی طرف سے اطمینان نصیب ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے شمالِ عرب اور وسطِ عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخر کر لیا۔ صلح حُدَیبیہ پر تین ہی مہینے گزرے تھے کہ یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ، خیبر فتح ہو گیا اور اس کے بعد فدک، وادی القُریٰ، تیما، اور تبوک کی یہودی بستیاں اسلام کے زیرِ نگیں آتی چلی گئیں۔ پھر وسطِ عرب کے وہ تمام قبیلے بھی، جو یہود اور قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے، ایک ایک کر کے تابع فرمان ہو گئے۔ اس طرح حدیبیہ کی صلح نے دو ہی سال کے اندر عرب میں قوت کا توازن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہو گیا۔

یہ تھیں وہ برکات جو مسلمانوں کو اُس صلح سے حاصل ہوئیں جسے وہ اپنی ناکامی اور قریش اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ جو چیز اس صلح میں مسلمانوں کو ناگوار ہوئی تھی اور جسے قریش نے اپنی جیت سمجھا تھا وہ یہ تھی کہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ جانے والوں کو واپس کر دیا جائے گا اور مدینہ سے بھاگ کر مکہ جانے والوں کو واپس نہ کیا جائے گا۔ مگر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ یہ معاملہ بھی قریش پر اُلٹا پڑا اور تجربہ نے بتا دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ دُور رس نے اس کے کن نتائج کو دیکھ کر یہ شرط قبول کی تھی۔ صلح کے کچھ دنوں بعد مکہ سے ایک مسلمان ابوبَصیر

قریش کی قید سے بھاگ نکلے اور مدینہ پہنچے۔ قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور حضورؐ نے معاہدے کے مطابق انہیں اُن لوگوں کے حوالہ کر دیا جو ان کی گرفتاری کے لیے مکّہ سے بھیجے گئے تھے۔ مگر مکہ جاتے ہوئے راستہ میں وہ پھر ان کی گرفت سے بچ نکلے اور ساحل بحر احمر کے اُس راستے پر جا بیٹھے جس سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس کے بعد جس مسلمان کو بھی قریش کی قید سے بھاگ نکلنے کا موقع ملتا وہ مدینہ جانے کے بجائے ابوبصیر کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا، یہاں تک کہ ۷۰ آدمی وہاں جمع ہو گئے اور انہوں نے قریش کے قافلوں پر چھاپے مار مار کر ان کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ آخر کار قریش نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مدینہ بلا لیں، اور حُدیبیہ کے معاہدے کی وہ شرط آپ سے آپ ساقط ہو گئی۔

یہ تاریخی پس منظر نگاہ میں رکھ کر اس سورہ کو پڑھا جائے تو اسے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا کارنامہ

ابوالاعلیٰ مودودی

(۲)

صحابۂ کرام کے بارے میں — "ہم صحابہ کا ذکر بھلائی کے سوا اور کسی طرح نہیں کرتے"[۲۳]

عقیدۂ طحاویہ میں اس کی مزید تفصیل یہ ہے:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں، ان میں سے کسی کی محبت میں حد سے نہیں گزرتے اور نہ کسی سے تبرّی کرتے ہیں۔ ان سے بغض رکھنے والے اور بُرائی کے ساتھ ان کا ذکر کرنے والے کو ہم ناپسند کرتے ہیں، اور ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی اور طرح نہیں کرتے"[۲۴]

اگرچہ صحابہ کی خانہ جنگی کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ نے اپنی رائے ظاہر کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ وہ صاف طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی جن لوگوں سے بھی جنگ ہوئی (اور ظاہر ہے کہ اس میں جنگِ جمل و صِفّین کے شرکاء شامل ہیں)، ان کے مقابلہ میں علی زیادہ برسرِ حق تھے[۲۵] لیکن وہ دوسرے فریق کو مطعون کرنے سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔

---

۲۳ ملا علی قاری، ص ۸۷۔ المغنیساوی، ص ۲۶

۲۴ ابن ابی العز، ص ۳۹۸

۲۵ المکی، ج ۲، ص ۸۳، ۸۴۔ الکردری، ج ۲ ص ۷۱، ۷۲۔ یہ رائے بھی تنہا امام ابو حنیفہؒ کی نہ تھی بلکہ تمام اہل السنت کے درمیان اس پر اتفاق ہو چکا تھا جیسا کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ (ج ۲، ص ۵۰۲) میں بیان کیا ہے۔

تعریفِ ایمان "ایمان نام ہے اقرار اور تصدیق کا"[26]

الوصیۃ میں اس کی تشریح امام نے اس طرح کی ہے: "ایمان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کا نام ہے" پھر کہتے ہیں: "نہ اقرار اکیلا ایمان ہے اور نہ محض معرفت ہی کو ایمان کہا جا سکتا ہے" آگے چل کر اس کی مزید تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں: "عمل ایمان سے الگ ایک چیز ہے اور ایمان عمل سے الگ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بسا اوقات مومن سے عمل مرتفع ہو جاتا ہے مگر ایمان اس سے مرتفع نہیں ہوتا ... مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ فقیر پر زکوٰۃ واجب نہیں، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر ایمان واجب نہیں"[27] اس طرح انہوں نے خوارج کے اس خیال کی تردید کر دی کہ عمل ایمان کی حقیقت میں شامل ہے اور گناہ لازماً عدم ایمان کا ہم معنی ہے۔

گناہ اور کفر کا فرق "ہم کسی مسلمان کو کسی گناہ کی بنا پر، خواہ وہ کیسا ہی بڑا گناہ ہو، کافر نہیں قرار دیتے جب تک کہ وہ اس کے حلال ہونے کا قائل نہ ہو۔ ہم اس سے ایمان کا نام سلب نہیں کرتے بلکہ اسے حقیقتاً مومن قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک مومن شخص فاسق ہو اور کافر نہ ہو"[28]

الوصیۃ میں امام اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:

"امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گناہ گار سب مومن ہیں، کافر نہیں ہیں"[29]

عقیدۂ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح یہ ہے:

"بندہ خارج از ایمان نہیں ہوتا مگر صرف اُس چیز کے انکار سے جس کے اقرار نے اسے داخلِ ایمان کیا تھا"[30]

---

[26] ملا علی قاری، ص ۱۰۳۔ المغنیساوی، ص ۳۳

[27] ملا حسین، الجوہرۃ المُنیفۃ فی شرح وصیۃ الامام ابی حنیفہ، ص ۳، ۶، ۷۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد، ۱۳۲۱ھ

[28] ملا علی قاری ص ۸۶ ـ ۸۹۔ المغنیساوی، ص ۲۷ ـ ۲۸

[29] ملا حسین، ص ۶

[30] ابن ابی العز، ص ۲۶۵

اس عقیدے اور اس کے اجتماعی نتائج (SOCIAL CONSEQUENCES) پر پوری روشنی اُس مناظرے سے پڑتی ہے جو ایک مرتبہ خوارج اور امام ابو حنیفہ کے درمیان اسی مسئلے پر ہوا تھا۔ خارجیوں کی ایک بڑی جماعت ان کے پاس آئی اور کہا کہ مسجد کے دروازہ پر دو جنازے ہیں۔ ایک ایسے شرابی کا ہے جو شراب پیتے پیتے مرگیا۔ دوسرا ایک عورت کا ہے جو زنا سے حاملہ ہوئی اور شرم کے مارے خودکشی کر کے مرگئی۔ امام نے پوچھا یہ دونوں کس ملت سے تھے؟ کیا یہودی تھے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پوچھا عیسائی تھے؟ کہا نہیں۔ پوچھا مجوسی تھے؟ وہ بولے نہیں۔ امام نے کہا پھر آخر وہ کس ملت سے تھے؟ انہوں نے جواب دیا اُس ملت سے جو کلمۂ اسلام کی شہادت دیتی ہے۔ امام نے کہا بتاؤ یہ ایمان کا ⅓ ہے یا ¼ یا ⅕؟ وہ بولے کہ ایمان کا تہائی چوتھائی نہیں ہوتا۔ امام نے کہا اس کلمے کی شہادت کو آخر تم ایمان کا کتنا حصہ مانتے ہو؟ وہ بولے پورا ایمان۔ اس پر امام نے فوراً کہا جب تم خود انہیں مومن کہہ رہے ہو تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ وہ کہنے لگے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ وہ دوزخی ہیں یا جنّتی۔ امام نے جواب دیا اچھا اگر تم پوچھنا ہی چاہتے ہو تو میں ان کے بارے میں وہی کہتا ہوں جو اللہ کے نبی ابراہیمؑ نے ان سے بدتر گناہ گاروں کے متعلق کہا تھا کہ "خدایا جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو آپ غفور رحیم ہیں" (ابراہیم آیت ۳۶)۔ اور جو اللہ کے ایک اور نبی عیسیٰؑ نے ان سے بھی زیادہ بڑے گناہ گاروں کے متعلق کہا تھا کہ "اگر آپ انہیں عذاب دیں تو آپ کے بندے ہیں، معاف فرما دیں تو آپ زبردست اور دانا ہیں" (المائدہ: ۱۱۸)۔ اور جو اللہ کے ایک تیسرے نبی نوحؑ نے کہا تھا کہ "ان لوگوں کا حساب لینا تو میرے رب کا کام ہے، کاش تم سمجھو۔ اور میں مومنوں کو دھتکارنے والا نہیں ہوں" (الشعراء، ۱۱۳-۱۱۴)۔ اس جواب کو سُن کر ان خارجیوں کو اپنے خیال کی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا۔[۳۱]

گناہ گار مومن کا انجام | "ہم یہ نہیں کہتے کہ مومن کے لیے گناہ نقصان دہ نہیں ہے۔ اور ہم نہ یہ کہتے ہیں کہ مومن دوزخ میں نہیں جائے گا اور نہ یہی کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اگر وہ فاسق ہو۔"[۳۲]

۳۱؎ المکی، ج ۱، ص ۱۲۴-۱۲۵　　　　۳۲؎ ملا علی قاری، ص ۹۲۔ المغنیسادی، ص ۲۸-۲۹

"اور ہم مرجیہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں ضرور مقبول اور ہماری برائیاں ضرور معاف ہو جائیں گی۔"[۳۳]

عقیدۂ طحاویہ اس پر اتنا اضافہ اور کرتا ہے:

"ہم اہلِ قبلہ میں سے کسی کے نہ جنتی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں نہ دوزخی ہونے کا۔ اور نہ ہم ان پر کفر یا شرک یا منافقت کا حکم لگاتے ہیں جب تک کہ ان سے ایسی کسی بات کا عملاً ظہور نہ ہو، اور ان کی نیتوں کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔"[۳۴]

اس عقیدے کے نتائج اس طرح امام نے شیعہ و خوارج اور معتزلہ و مرجیہ کی انتہائی آراء کے درمیان ایک ایسا متوازن عقیدہ پیش کیا جو مسلم معاشرے کو انتشار اور باہمی تصادم و منافرت سے بھی بچاتا ہے اور اس کے افراد کو اخلاقی بے قیدی اور گناہوں پر جسارت سے بھی روکتا ہے۔ جس فتنے کے زمانے میں امام نے عقیدۂ اہلِ سنّت کی یہ وضاحت پیش کی تھی، اس کی تاریخ کو نگاہ میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا جس سے انہوں نے امت کو راہِ اعتدال پر قائم رکھنے کی سعئ بلیغ فرمائی تھی۔ اس عقیدے کے معنی یہ تھے کہ یہ امّت اُس ابتدائی اسلامی معاشرے پر پورا اعتماد رکھتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔ اُس معاشرے کے لوگوں نے جو فیصلے بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ کیے تھے، امّت ان کو تسلیم کرتی ہے۔ جن اصحاب کو انہوں نے یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب کیا تھا، ان کی خلافت کو بھی اور ان کے زمانے کے فیصلوں کو بھی وہ آئینی حیثیت سے درست مانتی ہے۔ اور شریعت کے اُس پورے علم کو بھی وہ قبول کرتی ہے جو اس معاشرے کے افراد (یعنی صحابۂ کرام) کے ذریعہ سے بعد کی نسلوں کو ملا ہے۔ یہ عقیدہ اگرچہ امام ابوحنیفہ کا اپنا ایجاد کردہ نہ تھا بلکہ امّت کا سوادِ اعظم اس وقت یہی عقیدہ رکھتا تھا، مگر امام نے اسے تحریری شکل میں مرتب کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی کیونکہ اس سے عام مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ متفرق گروہوں کے مقابلہ میں ان کا امتیازی مسلک کیا ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے انہیں اسلامی تاریخ میں لازوال عظمت عطا کی، یہ تھا کہ

---

[۳۳] ملّا علی قاری، ص ۹۳۔ المغنیساوی، ص ۲۹

[۳۴] ابن ابی العز، ص ۳۱۲-۳۱۳

انہوں نے اُس عظیم خلا کو اپنے بل بوتے پر بھر دیا جو خلافتِ راشدہ کے بعد شوریٰ کا سدِ باب ہو جانے سے اسلام کے قانونی نظام میں واقع ہو چکا تھا ہم اس کے اثرات و نتائج کی طرف پہلے اشارہ کر چکے ہیں ایک صدی کے قریب اس حالت پر گزر جانے سے جو نقصان رونما ہو رہا تھا اسے ہر صاحب فکر آدمی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف مسلم ریاست کے حدود سندھ سے اسپین تک پھیل چکے تھے بیسیوں قومیں اپنے الگ الگ تمدن، رسم و رواج اور حالات کے ساتھ اس میں شامل ہو چکی تھیں۔ اندرونِ ملک مالیات کے مسائل، تجارت اور زراعت اور صنعت و حرفت کے مسائل، شادی بیاہ کے مسائل، دستوری اور دیوانی اور فوجداری قوانین و ضوابط کے مسائل روز بروز سامنے آ رہے تھے۔ بیرونِ ملک دنیا بھر کی قوموں سے اس عظیم ترین سلطنت کے تعلقات تھے اور ان میں جنگ، صلح، سفارتی روابط، تجارتی لین دین، بحری و بری مسافرت، کسٹم وغیرہ کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اور مسلمان چونکہ اپنا ایک مستقل نظریہ، اصولِ حیات اور بنیادی قانون رکھتے تھے، اس لیے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے ہی نظامِ قانون کے تحت ان بے شمار نئے مسائل کو حل کریں۔ غرض ایک طرف وقت کا یہ زبردست چیلنج تھا جس سے اسلام کو سابقہ درپیش تھا۔ اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ کوئی ایسا مسلّم آئینی ادارہ باقی نہ رہا تھا جس میں مسلمانوں کے معتمد علیہ اہلِ علم اور فقیہ اور مدبرین بیٹھ کر ان مسائل کو سوچتے اور شریعت کے اصولوں کے مطابق ان کا ایک مستند حل پیش کرتے جو سلطنت کی عدالتوں اور اس کے سرکاری محکموں کے لیے قانون قرار پاتا اور پوری مملکت میں یکسانی کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا۔

اس نقصان کو خلفاء، گورنر، حکّام اور قاضی سب محسوس کر رہے تھے، کیونکہ انفرادی اجتہاد اور معلومات کے بل پر روزمرہ پیش آنے والے اتنے مختلف مسائل کو بر وقت حل کر لینا ہر مفتی، حاکم، جج اور ناظم محکمہ کے بس کا کام نہ تھا، اور اگر فرداً فرداً انہیں حل کیا بھی جاتا تھا تو اس سے بے شمار متضاد فیصلوں کا ایک جنگل پیدا ہو رہا تھا۔ مگر دشواری یہ تھی کہ ایسا ایک ادارہ حکومت ہی قائم کر سکتی تھی، اور حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو خود جانتے تھے کہ مسلمانوں میں ان کا کوئی اخلاقی وقار و اعتماد نہیں ہے، جن کے لیے فقہاء کا سامنا کرنا تو درکنار

ان کو برداشت کرنا بھی مشکل تھا، جن کے تحت بننے والے قوانین کسی حالت میں بھی مسلمانوں کے نزدیک اسلامی نظامِ قانون کا جزء نہ بن سکتے تھے۔ ابن المقفع نے اپنے رسالۃ الصحابہ میں اس خلا کو بھرنے کے لیے المنصور کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ خلیفہ اہل علم کی ایک کونسل بنائے جس میں ہر نقطۂ نظر کے علماء پیش آمدہ مسائل پر اپنا اپنا علم اور خیال پیش کریں، پھر خلیفہ خود ہر مسئلے پر اپنا فیصلہ دے اور وہی قانون ہو۔ لیکن منصور اپنی حقیقت سے اتنا بے خبر نہ تھا کہ یہ حماقت کرتا۔ اس کے فیصلے ابوبکرؓ و عمرؓ کے فیصلے نہ بن سکتے تھے۔ اس کے فیصلوں کی عمر خود اس کی اپنی عمر سے زیادہ نہ ہو سکتی تھی بلکہ اس کی زندگی میں بھی یہ توقع نہ تھی کہ پوری مملکت میں کوئی ایک مسلمان ہی ایسا مل جائے گا جو اس کے منظور کیے ہوئے قانون کی مخلصانہ پابندی کرے۔ وہ ایک لادینی قانون تو ہو سکتا تھا مگر اسلامی قانون کا ایک حصہ ہرگز نہ ہو سکتا تھا۔

اس صورتِ حال میں امام ابوحنیفہ کو ایک بالکل نرالا راستہ سوجھا اور وہ یہ تھا کہ وہ حکومت سے بے نیاز رہ کر خود ایک غیر سرکاری مجلس وضع قانون (PRIVATE LEGISLATURE) قائم کریں۔ یہ تجویز ایک انتہائی بدیع الفکر آدمی ہی سوچ سکتا تھا، اور مزید برآں اس کی ہمت صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو اپنی قابلیت پر، اپنے کردار پر، اور اپنے کردار پر اور اپنے اخلاقی وقار پر اتنا اعتماد رکھتا ہو کہ اگر وہ ایسا کوئی ادارہ قائم کر کے قوانین مدوّن کرے گا تو کسی سیاسی قوتِ نافذہ (POLITICAL SANCTION) کے بغیر اس کے مدوّن کردہ قوانین اپنی خوبی، اپنی صحت، اپنی مطابقتِ احوال، اور اپنے مدوّن کرنے والوں کے اخلاقی اثر کے بل پر خود نافذ ہوں گے، قوم خود ان کو قبول کرے گی اور سلطنتیں آپ سے آپ ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گی۔ امام کوئی غیب دان نہ تھے کہ پیشگی اُن نتائج کو دیکھ لیتے جو فی الواقع ان کے بعد نصف صدی کے اندر ہی برآمد ہو گئے۔ مگر وہ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو جانتے تھے، مسلمانوں کے اجتماعی مزاج سے واقف تھے، اور وقت کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک کمال درجہ کے دانا و دُور اندیش انسان کی حیثیت سے بالکل صحیح اندازہ کر لیا کہ وہ اِس خلا کو اپنی نجی حیثیت سے بھر سکتے ہیں اور ان کے بھرنے سے یہ خلا

واقعی بھر جائے گا۔

اس مجلس کے شرکاء امام کے اپنے شاگرد تھے جن کو سالہا سال تک انہوں نے اپنے مدرسۂ قانون میں باقاعدہ قانونی مسائل پر سوچنے، علمی طرز پر تحقیقات کرنے اور دلائل سے نتائج مستنبط کرنے کی تربیت دی تھی۔ ان میں سے قریب قریب ہر شخص امام کے علاوہ وقت کے دوسرے بڑے بڑے اساتذہ سے بھی قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے مددگار علوم، مثلاً لغت، نحو، ادب اور تاریخ و سیر کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ مختلف شاگرد مختلف علوم کے اختصاصی ماہر سمجھے جاتے تھے، مثلاً کسی کو قیاس و رائے میں نمایاں مقام حاصل تھا، کسی کے پاس احادیث اور صحابہ کے فتاوی اور پچھلے خلفاء و قضاۃ کے نظائر کی وسیع معلومات تھیں، اور کوئی علم تفسیر، یا قانون کے کسی خاص شعبے، یا لغت اور نحو یا مغازی کے علم میں اختصاص رکھتا تھا۔ ایک دفعہ امام نے خود اپنی ایک گفتگو میں بتایا کہ یہ کس مرتبے کے لوگ تھے:

"یہ ۳۶ آدمی ہیں جن میں سے ۲۸ قاضی ہونے کے لائق ہیں، ۶ فتوی دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور دو اس درجے کے آدمی ہیں کہ قاضی اور مفتی تیار کر سکتے ہیں۔"[۵۳]

اس مجلس کا طریق کار جو امام کے معتبر سوانح نگاروں نے لکھا ہے وہ ہم خود انہی کے الفاظ میں یہاں نقل کرتے ہیں۔ الموفق بن احمد المکی (م ۵۶۸ھ - ۱۱۷۲ء) لکھتا ہے:

"ابوحنیفہ نے اپنا مذہب ان کے (یعنی اپنے فاضل شاگردوں کے) مشورے سے مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی حد وسع تک دین کی خاطر زیادہ سے زیادہ جانفشانی کرنے کا جو جذبہ رکھتے تھے اور خدا و رسول خدا اور اہل ایمان کے لیے جو کمال درجہ کا اخلاص ان کے دل میں تھا اس کی وجہ سے انہوں نے شاگردوں کو چھوڑ کر یہ کام محض اپنی انفرادی رائے سے کر ڈالنا پسند نہ کیا۔ وہ ایک ایک مسئلہ ان کے سامنے پیش کرتے تھے، اس کے مختلف پہلو ان کے سامنے لاتے تھے، جو کچھ ان کے پاس علم اور خیال ہوتا اسے سنتے اور اپنی رائے بھی بیان کرتے حتی کہ بعض اوقات ایک ایک مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مہینہ مہینہ بھر اور اس سے بھی زیادہ

۵۳؎ المکی، ج ۲، ص ۲۴۶

لگ جاتا تھا۔ آخر جب ایک رائے قرار پا جاتی تو اسے قاضی ابو یوسف کتب اصول میں ثبت کرتے۔[۳۶]

ابن البزاز الکردری (صاحب فتاویٰ بزازیہ م ۸۲۷ھ - ۱۴۲۴ء) کا بیان ہے:

"ان کے شاگرد ایک مسئلے پر خوب دل کھول کر بحث کرتے اور ہر فن کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرتے۔ اس دوران میں امام خاموشی کے ساتھ ان کی تقریریں سنتے رہتے تھے پھر جب امام زیر بحث مسئلے پر اپنی تقریر شروع کرتے تو مجلس میں ایسا سکوت ہوتا جیسے یہاں ان کے سوا کوئی اور نہیں بیٹھا ہے۔"[۳۷]

عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اس مجلس میں تین دن تک مسلسل ایک مسئلے پر بحث ہوتی رہی۔ تیسرے دن شام کے وقت میں نے جب اللہ اکبر کی آوازیں سنیں تو پتہ چلا کہ اس بحث کا فیصلہ ہو گیا۔[۳۸] امام کے ایک اور شاگرد ابو عبداللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں امام ابوحنیفہ اپنی جو رائیں ظاہر کرتے تھے انہیں بعد میں وہ پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"میں امام کے اقوال ان کو پڑھ کر سناتا تھا۔ ابو یوسف (مجلس کے فیصلے ثبت کرتے ہوئے) ساتھ ساتھ اپنے اقوال بھی درج کر دیا کرتے تھے۔ اس لیے پڑھتے وقت میں کوشش کرتا تھا کہ ان کے اقوال چھوڑتا جاؤں اور صرف امام کے اپنے اقوال انہیں سناؤں۔ ایک روز میں چوک گیا اور دوسرا قول بھی میں نے پڑھ دیا۔ امام نے پوچھا یہ دوسرا قول کس کا ہے؟"[۳۹]

۳۶؎ المکی، ج ۲، ص ۱۳۳

۳۷؎ الکردری، ج ۲، ص ۱۰۸

۳۸؎ المکی، ج ۲، ص ۵۴

۳۹؎ الکردری، ج ۲، ص ۱۰۹

اس کے ساتھ المکی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کے جو فیصلے لکھے جاتے تھے ان کو الگ الگ عنوانات کے تحت کتابوں اور ابواب میں مرتب بھی امام ابوحنیفہؒ ہی کی زندگی میں کر دیا گیا تھا:

"ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس شریعت کے علم کو مدوّن کیا۔ ان سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابوحنیفہ نے اس کو کتابوں اور جدا جدا عنوانات کے تحت ابواب کی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔"[۴۸]

اس مجلس میں، جیسا کہ ہم پہلے المکی ہی کے حوالہ سے بتا چکے ہیں، ۸۳ ہزار قانونی مسائل طے کیے گئے تھے۔ اس میں صرف وہی مسائل زیر بحث نہیں آتے تھے جو اُس وقت تک عملاً لوگوں کو یا ریاست کو پیش آ چکے تھے، بلکہ معاملات کی امکانی صورتیں فرض کر کر کے ان پر بھی بحث کی جاتی اور ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا تاکہ آئندہ اگر کبھی کوئی نئی صورت پیش آ جائے جواب تک نہ پیش آئی ہو تو قانون میں پہلے سے اس کا حل موجود ہو۔ یہ مسائل قریب قریب ہر شعبۂ قانون سے متعلق تھے۔ بین الاقوامی قانون[۴۹] (جس کے لیے السِّیَر کی اصطلاح مستعمل تھی)، دستوری قانون، دیوانی و فوجداری قانون، قانونِ شہادت، ضابطۂ عدالت، معاشی زندگی کے ہر شعبے کے الگ قوانین، نکاح و طلاق

---

[۴۸] المکی، ج ۲، ص ۱۳۶

[۴۹] موجودہ زمانے کے لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ بین الاقوامی قانون ایک جدید چیز ہے اور پہلا شخص جس نے اس شعبۂ قانون کی بنا ڈالی ہالینڈ کا گروٹیس (GROTIUS ۱۵۸۳ء-۱۶۴۵ء) ہے۔ لیکن جس شخص نے بھی امام ابوحنیفہ کے شاگرد محمد بن حسن الشیبانی (۱۳۲-۱۸۹ھ - ۷۴۹-۸۰۵ء) کی کتاب السِّیَر دیکھی ہے وہ جانتا ہے کہ گروٹیس سے نو سو برس پہلے یہ علم امام ابوحنیفہ کے ہاتھوں بڑی تفصیل کے ساتھ مدوّن ہو چکا تھا اور اس میں بین الاقوامی قانون کے اکثر گوشوں پر اور اس کے بڑے بڑے نازک مسائل پر بحث کی گئی تھی۔ حال میں اس حقیقت کو اہلِ علم کے ایک گروہ نے تسلیم بھی کیا ہے اور جرمنی میں شیبانی سوسائٹی آف انٹرنیشنل لا قائم کی گئی ہے۔

اور وراثت وغیرہ شخصی احوال کے قوانین، اور عبادات کے احکام، یہ سب عنوانات ہم کو ان کتابوں کی فہرستوں میں ملتے ہیں جو اس مجلس کے فراہم کردہ مواد سے امام ابویوسف نے اور پھر امام محمد بن حسن الشیبانی نے بعد میں مرتب کیں۔

اس باقاعدہ تدوینِ قانون کا اثر یہ ہوا کہ انفرادی طور پر کام کرنے والے مجتہدوں، مفتیوں اور قاضیوں کا کام ساقط الاعتبار ہوتا چلا گیا۔ قرآن و حدیث کے احکام اور سابقہ فیصلوں اور فتاویٰ کے نظائر کی چھان بین کر کے اہلِ علم کی ایک مجلس نے ابوحنیفہ جیسے نکتہ رس آدمی کی صدارت و رہنمائی میں شریعت کے جو احکام منقح صورت میں نکال کر رکھ دیئے تھے، اور پھر اصولِ شریعت کے تحت وسیع پیمانے پر اجتہاد کر کے زندگی کے ہر پہلو میں پیش آنے والی امکانی ضرورتوں کے لیے جو قابلِ عمل قوانین مرتب کر دیئے تھے، ان کے بعد منتشر افراد کے مدوّن کیے ہوئے احکام مشکل ہی سے وقیع ہو سکتے تھے۔ اس لیے جونہی یہ کام منظرِ عام پر آیا عوام اور حکام اور قضاۃ، سب اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو گئے، کیونکہ یہ وقت کی مانگ تھی اور لوگ مدت سے اسی چیز کے حاجتمند تھے۔ چنانچہ مشہور فقیہ یحییٰ بن آدم (م ۲۰۳ھ - ۸۱۸ء) کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے اقوال کے آگے دوسرے فقہاء کے اقوال کا بازار سرد پڑ گیا، انہی کا علم مختلف علاقوں میں پھیل گیا، اسی پر خلفاء اور ائمہ اور حکام فیصلے کرنے لگے اور معاملات کا چلن اسی پر ہو گیا۔[۴۲] خلیفہ مامون (۱۹۸-۲۱۸ھ - ۸۱۳-۸۳۳ء) کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے یہ حالت ہو گئی کہ ایک دفعہ وزیر اعظم فضل بن سہل کو ابوحنیفہ کے ایک مخالف فقیہ نے مشورہ دیا کہ حنفی فقہ کا استعمال بند کرنے کے احکام جاری کر دیئے جائیں۔ وزیر اعظم نے باخبر اور معاملہ فہم لوگوں کو بلا کر اس معاملے میں رائے لی۔ انہوں نے بالاتفاق کہا، "یہ بات نہیں چلے گی اور سارا ملک آپ لوگوں پر ٹوٹ پڑے گا۔ جس شخص نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے وہ ناقص العقل ہے"۔ وزیر نے کہا، میں خود بھی اس خیال سے متفق نہیں ہوں اور امیرالمومنین بھی اس پر راضی نہ ہوں گے۔[۴۳]

---

[۴۲] المکی، ج ۲، ص ۱۴۱

[۴۳] المکی، ج ۲، ص ۱۵۷ - ۱۵۸ - الکردری، ج ۲، ص ۱۰۶ - ۱۰۷

اس طرح تاریخ کا یہ اہم واقعہ رُونما ہُوا کہ ایک شخص واحد کی قائم کی ہوئی نجی مجلس وضع قوانین کا مرتب کیا ہُوا قانون محض اپنے اوصاف اور اپنے مرتب کرنے والوں کی اخلاقی ساکھ کے بل پر ملکوں اور سلطنتوں کا قانون بن کر رہا۔ اس کے ساتھ دوسرا اہم نتیجہ اس کا یہ بھی ہُوا کہ اس نے مسلم مفکرینِ قانون کے لیے اسلامی قوانین کی تدوین کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ بعد میں جتنے دوسرے بڑے بڑے فقہی نظام بنے وہ اپنے طرزِ اجتہاد اور نتائجِ اجتہاد میں چاہے اس سے مختلف ہوں، مگر ان کے لیے نمونہ یہی تھا جسے سامنے رکھ کر ان کی تعمیر کی گئی۔

(نوٹ: اس سلسلہ مضامین کا ایک باب "خلافت اور اس کے متعلقہ مسائل میں امام ابوحنیفہ کا مسلک" اگست و ستمبر ۶۳ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہو چکا ہے)

مسئلہ قُبرُص[1]

خلیل حامدی

[پچھلے شمارے میں ہم نے ترکی کے بارے میں چند گزارشات پیش کی تھیں۔ اب ہم ترکی کے سب سے بڑے مسئلہ کا اُس کے تاریخی پس منظر کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ قبرص کا مسئلہ ترکی کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو پاکستان کے لیے کشمیر کی حیثیت ہے۔ بلکہ ترکی کو بھی قبرص اور یونان کے غنڈوں اور ہٹ دھرم رہنماؤں سے اسی طرح سابقہ درپیش ہے جیسا پاکستان کو کشمیر کے جن سنگھیوں اور بھارت کے مکار حکمرانوں سے ہے۔]

بخاری اور مسلم میں مذکور ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُمّ حرام دالرّمیصاء) کے گھر میں دوپہر کو خوابِ راحت فرما رہے تھے کہ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے۔ اُمّ حرام نے عرض کیا: کیا حضور میری کسی بات پر ہنسی فرما رہے ہیں؟ آنجناب نے فرمایا: مجھے خواب میں اپنی امّت کا وہ گروہ نظر آیا ہے جو اسلامی فتوحات کی خاطر سمندر کو چیر رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا بادشاہ تختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت امّ حرام نے اس گروہ کی عظمت اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسرّت دیکھ کر عرض کیا: یا رسول اللہ، دعا فرمائیے اللہ مجھے بھی اس مبارک گروہ میں شامل کرے۔ آپؐ نے فرمایا: تم سب سے پہلی فوج میں ہوگی۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب اور

---

[1] قُبرُص (س سے) عربی زبان میں تانبے کی اعلیٰ قسم کو کہتے ہیں۔ اس جزیرے کے اندر یہ دھات کثرت سے پائی جاتی ہے اس لیے عربوں نے اس کا نام ہی قُبرُص رکھ دیا۔ قبرص بحر متوسط کے مشرق میں واقع ہے۔ ترکی سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ہے اور شام سے ۶۰ میل۔ اس کا رقبہ ۳۵۷۲ مربع میل ہے، لمبائی شرقاً غرباً ۱۴۰ میل اور چوڑائی شمالاً جنوباً ۶۰ میل ہے۔

حضرت اُمِّ حرام رضی اللہ عنہا کی آرزو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں شرمندۂ تعبیر ہوئی۔ اسلامی فوج نے سمندر عبور کر کے اس جزیرہ پر لشکر کشی کی اور ۶۴۷ء میں یہ جزیرہ اسلامی قلمرو کے تابع ہو گیا۔ حضرت اُمِّ حرام اس فوج میں اپنے خاوند حضرت عُبادہ بن صامت کے ہمراہ شریک ہوئیں۔ قُبرص کے ساحل پر اُتری تھیں کہ سواری بدک جانے کی وجہ سے گر کر شہید ہو گئیں اور سرزمین قبرص کی آغوش میں چلی گئیں۔ آج تک آپؓ کی قبر اس جزیرے پر پہلی اسلامی فتح کے نقوشِ زرّیں کی یاد دلا رہی ہے۔

قدیم زمانے میں یہ جزیرہ یونانیوں اور فینیقیوں کے قبضہ میں رہا۔ ان کے بعد اشوریوں اور مصریوں نے اس پر حکمرانی کی۔ پھر اہلِ فارس کے زیرِ نگیں ہوا۔ ان کے ہاتھوں سے نکل کر رومیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اسلام کے داخلہ سے قبل وہاں بازنطینیوں کا تسلّط تھا۔ ۶۴۷ء میں جب پہلی مرتبہ وہاں لشکرِ اسلام نے قدم رکھا تو بازنطینی طاقت نے سخت مزاحمت کی۔ دو سال تک (۶۴۷ء - ۶۴۹ء) اسلامی حکومت کے تحت رہنے کے بعد اس پر دوبارہ بازنطینیوں کا غلبہ ہو گیا۔ ۶۵۳ء میں اس پر پھر اسلامی افواج نے چڑھائی کی۔ اہلِ قُبرص نے ایک مقررہ مقدار پر خراج کے عوض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عہدِ ذِمّہ استوار کر لیا اور پھر رُبع صدی سے زیادہ تک وہاں اسلامی پرچم لہراتا رہا۔ عباسی دور میں جب عبدالملک بن صالح سرحدی علاقوں کا گورنر تھا تو اس جزیرہ کے باشندے رومیوں کے مسلسل دباؤ اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اسلامی سلطنت سے بدعہدی پر اُتر آئے۔ عبدالملک بن صالح نے فقہائے اسلام کے سامنے یہ صورتِ حال رکھی اور فتویٰ دریافت کیا کہ کیا ان کی بدعہدی کے پیشِ نظر ان پر چڑھائی کی جائے؟ امام اوزاعی، لیث بن سعد، مالک بن انس جیسے ائمہ کبار کے فتاویٰ کی روشنی میں عبدالملک بن صالح نے جزیرہ کے فتنہ پرداز گروہ کو اصلاحِ احوال کی مہلت دی۔ مگر اسلامی حکومت کی خیر خواہانہ کوششوں کے باوجود رومی برابر سازشیں کرتے رہے اور بازنطینی بحری بیڑا پے در پے حملے کرتا رہا جس کی وجہ سے اسلامی اثرات کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے گئے۔ اور عرصہ دراز تک داخلی اور خارجی طالع آزماؤں کا دور دورہ رہا۔

انگریز مصنف ولبرڈ (WILLIBARD) نے ۷۲۲ء میں قبرص کی سیاحت کے بعد تأثرات

لکھے کہ "قبرص اس وقت عرب اور یونانی نفوذ کے درمیان کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ جزیرہ کے اندر مسلمانوں کے استقرار کو ختم کرنے کے لیے بازنطینی بحری بیڑے نے بھرپور طاقت استعمال کی ہے۔ بایں ہمہ اسے شکست مسلسل کا سامنا ہے۔" ڈھائی صدیوں تک اسلام کا وجود اس جزیرے کے اندر اسی کشمکش میں رہا۔ اور بالآخر ۹۶۵ء میں نیقفورس دوم فوکس (NICEPHORUS II PHOCUS) نے مسلمانوں کے ساتھ غداری کی اور بازنطینیوں کی صدیوں کی آرزو کو پورا کر دیا۔ اس کے بعد یہ جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے کلیتہً نکل گیا۔ مسلم آبادی کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا اور تقریباً ۶ صدیوں تک یہ خطۂ زمین اسلام کی حیات افروز شعاعوں سے محروم رہا۔ اس زمانہ میں وینس اور جینوا کی تہذیب وہاں کے سیاہ و سفید کی مالک رہی۔

۱۵۷۱ء میں عثمانی ترکوں کے ہاتھوں یہ جزیرہ ایک مرتبہ پھر نورِ اسلام سے منور ہوا اور دلاورِ عثمانی فوجوں نے اسے عیسائیوں کے پنجہ سے آزاد کروایا۔ اس سے پہلے ترکوں کی شمشیر خارا شکن کے سامنے بلغاریہ، مقدونیہ، تسالیہ (تھسلی)، تراقیہ (تھریس)، نواحِ قسطنطنیہ، خلقیدونیہ (ایشیائے کوچک) البانیہ، بوسنہ (یوگوسلاویہ)، سرویہ اور ہنگری سرنگوں ہو چکے تھے۔ اس جزیرے کے اسلامی قلمرو میں دوبارہ شامل ہو جانے کے بعد اب کوئی طاقت ایسی نہ رہی جو عثمانیوں کی مزاحمت کر سکتی۔ اور جب سلیمان دوم مسند خلافت پر متمکن ہوا (۱۶۸۹ء - ۱۶۹۱ء) تو بحرِ ایجہ (ایجینیہ) اسلامی سمندر بن چکا تھا جس کے ہر ساحل پر اذانیں گونجتی تھیں اور اسلام کے عَلَم لہراتے تھے۔

۱۸۷۸ء تک یہ جزیرہ براہ راست عثمانی سلطنت کے تحت رہا۔ اس جزیرے کی یہ تین صدیاں اس کی تاریخ کا نہایت روشن باب ہیں۔ ۱۵۷۰ء میں جب عثمانی ترکوں نے اس جزیرے کو رومیوں سے بحال کرایا اور بندقیہ (وینس) کو بالآخر آل عثمان کا اقتدار تسلیم کرنا پڑا تو اس کے بعد یہ جزیرہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی حکومت کی صورت اختیار کر گیا۔ فساد و ظلم کی جگہ امن و عدل کی بہار آ گئی۔ افلاس اور مسکنت کا خاتمہ ہو گیا اور خوشحالی اور رفاہیت کا دور دورہ ہو گیا۔ رومیوں کے سیاسی جبر، مذہبی تاریک خیالی اور معاشرتی عدمِ مساوات نے قبرصی عوام کا ناطقہ تنگ کر رکھا تھا مگر عثمانیوں کی رواداری

علم دوستی، عدل گستری اور غیر معمولی اسلامی لگاؤ نے اُن کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ عثمانیوں نے زمامِ اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے یہ کام کیا کہ پُورے جزیرے کے اندر غلامی کو منسوخ کر کے تمام غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اور دوسرا کام یہ کیا کہ آرتھوڈکس کلیسا کو بحال کر دیا جسے میخائیل کیرولاریوس (۱۰۵۴ء) کے عہد میں کیتھولک کلیسا نے بددین قرار دے کر منسوخ کر دیا تھا[۱]۔ قبرص کی مسیحی آبادی کو شخصی قوانین پر عملدرآمد کرنے کی کھلی آزادی دے دی۔ اور مغرب کے کبر پرست عیسائیوں کی مذہبی آمریت سے مشرق کے عیسائیوں کو نجات دلائی۔ عثمانیوں کا یہ وہ کارنامہ ہے جسے مسیحی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جب عثمانی سلطنت پر ادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں تو برطانیہ کی حرص آز کی نگاہیں اس جزیرے کو ہڑپ کرنے کے لیے موقع کی تلاش کر رہی تھیں۔ چنانچہ زار روس نے جب اناضول (مشرقی صوبے) پر لشکر کشی کا خطرہ پیدا کیا تو موقع پرست برطانیہ نے فوراً آستانہ سے ربط قائم کیا اور سلطان کو یہ پیش کش کی کہ اگر سلطان قبرص کو برطانوی حکومت کے حوالے کر دے تو برطانیہ اس کے عوض سلطان کو فوجی مدد دے گا اور روسی نفوذ کا سدِ باب کرے گا۔ سلطان نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ ۴ جون ۱۸۷۸ء کو اس دفاعی معاہدے پر دستخط ہو گئے جس میں یہ واضح طور پر تحریر تھا کہ جزیرے کا نظم و نسق اگرچہ برطانیہ کی نگرانی میں ہوگا مگر یہ جزیرہ قانونی لحاظ سے خلافتِ عثمانیہ کا غیر منفک جز رہے گا۔ برطانیہ کے اقتدار کے بعد یہ جزیرہ عیسائیوں سے زیادہ یہودیوں کے فروغ کی آماجگاہ بن گیا۔ کیونکہ اس وقت برطانیہ کا وزیرِ اعظم اگرچہ عیسائی تھا مگر درحقیقت اس کی تمام تر ہمدردیاں یہودیوں کی صہیونی تحریک سے تھیں۔ اور اُس کی رُوح ہمیشہ یہود کے اِرد گرد منڈلاتی رہتی تھی[۲]۔ یہودیوں نے اس جزیرہ کو بین الاقوامی تجارتی اڈے میں تبدیل کر دیا اور یونانیوں اور یہودیوں کو اس میں لا کر آباد کرنا شروع کر دیا۔ نتیجۃً آہستہ آہستہ مسلمان آبادی کا قافیہ تنگ ہونا شروع ہو گیا اور عملاً یہ جزیرہ دولتِ عثمانیہ سے الگ تھلگ ہو کر رہ گیا۔

۱۸۹۲ء میں مولانا شبلی مرحوم نے اس جزیرہ کی سیاحت کی ہے۔ انگریزوں کی عملداری کے باوجود اس

---

[۱] دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۶ ص ۹۵۳۔ قبرص کے موجودہ صدر میکاریوس کو اسی کلیسا کی طرف سے لارڈ بشپ کا منصب ملا ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو کتاب: "دنیائے یہود کی بیداری" تالیف صدر رسو کولو۔

جزیرے میں مسلمانوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ دینی تعلیم کا بہت رواج تھا اور نہایت معیاری درسگاہیں کتاب وسنّت کے نغموں سے گونج رہی تھیں۔ شرعی عدالتیں قائم تھیں جن میں مسلمانوں کے شخصی مقدّمات کا شریعت اسلامی کی رُو سے فیصلہ ہوتا تھا۔ لوگوں کی زبان ترکی تھی یہاں تک کہ عیسائی آبادی بھی بے تکلف ترکی زبان بولتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عوام کو اس کا پُورا پُورا احساس تھا کہ انگریزوں نے ان کی آزادی چھین رکھی ہے اور وہ سلطانِ ترکی ہی کو اپنا سربراہ تسلیم کرتے تھے۔ البتہ انگریزوں اور عیسائیوں نے سازش کے طور پر تجارت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ جزیرہ کے بڑے بڑے تجارتی مراکز اور بلند و بالا عمارات عیسائیوں کے قبضہ میں تھیں۔ وہ اس عارضی تسلّط کے ذریعہ جزیرہ کو اپنی مستقل کالونی میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ میں، جب عثمانی سلطنت جنگ کی لپیٹ میں تھی، انگریزوں نے یک طرفہ فیصلے کی رُو سے قُبرص کو برٹش امپائر میں ضم کر لیا۔ اس طرح نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد یہ جزیرہ برطانیہ کا "اٹوٹ انگ" بن گیا۔ دس سال کے بعد ۱۹۲۴ء کی لوزان کانفرنس میں ترکوں نے بھی مجبوراً اس انضمام کو تسلیم کر لیا اور اعلان کر دیا کہ "قبرص تاج برطانیہ کا مقبوضہ ہے"۔

جنگ عظیم دوم کے بعد قبرصی یونانیوں نے، جو اس خطّے کے اصل باشندے نہ تھے بلکہ یونان سے لا کر یہاں بسائے گئے تھے تاکہ مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کیا جا سکے، قبرص کو یونان کے اندر ضم کرنے کی کوشش کی، اور اپنی دہشت پسند تنظیموں کے ذریعہ سے پہلے انگریز حکّام کو ہراساں کرنے کی کوشش کی اور پھر مسلمانوں کو اپنے تشدّد و تخریب پسندی کا ہدف بنا لیا کیونکہ مسلمانوں نے قبرص کو یونان کا جز قرار دینے کی مخالفت کی تھی اور ان کی اسکیم کو ناکام بنا رہے تھے۔

قُبرُص کی آزادی کی تحریک جنگ عظیم دوم سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا مسلمانوں کے سر تھا۔ مگر جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں تحریک شروع ہوتے ہی عیسائیوں میں مذہبی تعصّب اُبھر آیا اور انہوں نے آزادی سے مراد قُبرُص کا یونان سے الحاق قرار دیا۔ ترک جو اقلیت میں تھے اس خطرے کو بھانپ گئے اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ قبرص کا اصل مالک ترکی ہے

اس لیے اس جزیرے کا الحاق اخلاقاً اور قانوناً ترکی سے ہونا چاہیے۔ اس صورت حال نے قبرص کے ترکوں کو دوگونہ مشکل سے دوچار کر دیا۔ ایک انگریزوں سے آزادی اور دوسرے قبرسی یونانیوں کی اکثریت سے نجات۔ بدقسمتی سے تحریکِ آزادی کے دوران ۱۹۵۱ء میں قبرسی کلیسا (آرتھوڈکس) نے میکاریوس کو کلیسا کا آرچ بشپ منتخب کر لیا۔ اس مکار پادری نے مذہبی لبادے کی آڑ میں آگ اور خون کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک طرف عیسائیوں کے مذہبی تعصب کو خوب بھڑکایا اور دوسری طرف یونان کی دہشت پسند تنظیم ایوکا اور اُس کے سفاک لیڈر جنرل گریواس کی خدمات حاصل کرلیں۔ مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کروا دیا۔ قبرسی ترکوں اور قبرسی یونانیوں کے درمیان نہ ٹلنے والی عداوت کے بیج بو دیئے۔ اور اس جزیرے کے امن کو ہمیشہ کے لیے خطرات کی دستبرد میں دے دیا۔

اگست ۱۹۶۰ء میں ۸۲ سال کے بعد اقتدار انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر جزیرے کے باشندوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ لیکن انتقالِ اقتدار سے پہلے جزیرے کی دونوں قوموں کے درمیان اُسی نوعیت کی شدید منافرت اور کشاکش کے بادل چھا چکے تھے جیسے برِعظیم ہند کی تقسیم کے وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تھے۔ چنانچہ اسی تلخ حقیقت کے پیشِ نظر قبرص کی ترک آبادی انتقالِ اقتدار سے قبل ہی اس مطالبہ پر متفق ہو چکی تھی کہ ہندوستان کی طرح قبرص کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر اُن کا یہ مطالبہ انگریز کی ڈپلومیسی کے سامنے صدا بصحرا ثابت ہوا اور اُن کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہو گیا۔

اس مفصّل تاریخی پس منظر کے بعد اب قبرص کے اصل مسئلہ کے چند پہلوؤں پر غور کیجیے:

قبرص کی آزادی کے معاہدہ میں قبرص کے آئین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے قبرص ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے جس کا نظامِ حکومت صدارتی ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کو اپنی اپنی زبان میں کاروبار چلانے کا حق ہے۔ انتظامی اختیارات عیسائی صدر مکاریوس اور مسلمان نائب صدر ڈاکٹر فاضل کوچک کو مشترکہ طور پر حاصل ہیں۔ ملک کے ایوان نمایندگان میں عیسائیوں کے لیے ۷۰ فیصد اور مسلمانوں کے لیے ۳۰ فیصد نشستیں مقرر ہیں۔ فوج اور پولیس پر صدر اور

نائب صدر کا منشتر کہ کنٹرول ہے۔ نائب صدر کو ہر معاملے اور ہر قانون کے خلاف حق تنسیخ حاصل ہے۔ آزادی کے وقت قبرس نے ترکی، برطانیہ اور یونان سے معاہدہ کیا تھا جس کی رُو سے آئین کی پابندی کی ضمانت دی گئی تھی۔

یہ آئین ایک طرف پوری طرح مسلمانوں کے تحفظ کا ضامن ہے اور دوسری طرف صدر مکاریوس کے ان عزائم کی راہ میں بھی حائل ہوتا ہے کہ قبرس کو یونان میں شامل کر دیا جائے۔ اس مکار پادری نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے آئین میں بجبر ترمیم کرنے کی تحریک چلا رکھی ہے۔ اس سلسلے میں اُس نے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۱ء میں اس نے جُداگانہ بلدیاتی اداروں کو ختم کر دینے کی تجاویز پیش کیں تاکہ قبرسی ترک اور قبرسی یونانیوں کا امتیاز ختم کر دیا جائے اور قبرسی ترکوں کی اقلیت کو عیسائی اکثریت کے اندر تحلیل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر فاضل کوچک نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور جب معاملہ عدالت تک پہنچا تو عدالت نے بھی مکاریوس کے دعویٰ کو ردّ کر دیا۔ اگست ۱۹۶۳ء میں اس نے دوبارہ یہ سازش شروع کر دی۔ اُس نے اعلان کیا کہ وہ آئین کو از سرِ نو مدوّن کرنا چاہتا ہے جس میں صدر اور نائب صدر کا حق تنسیخ ختم کر دیا جائے گا۔ عیسائی اور مسلمان بلدیات کی تفریق مٹا دی جائے گی۔ اور انتظامیہ میں مسلم نمایندگی کا تناسب ۳۰ فیصد سے گھٹا کر ۸ فیصد کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر فاضل کوچک نے اعلان کیا کہ اگر مکاریوس نے یک طرفہ طور پر آئین بدل دیا تو مسلمان عدم تعاون کی تحریک شروع کر دیں گے۔ مکاریوس کی ہٹ دھرمی نے جب تبدیلِ آئین کی اسکیم پر عمل درآمد شروع کیا تو مسلمانوں نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا جس کے نتیجے میں انہیں مکاریوس اور متعصب عیسائیوں اور یونانی غنڈوں کے ہاتھوں آگ اور خون کی ہولی کھیلنا پڑی اور ابھی تک کھیل رہے ہیں۔

مکاریوس کی ان تمام سازشوں، فساد انگیزیوں اور مسلم کش منصوبوں کا مدعا یہ ہے کہ قبرس میں ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ کسی مسلمان کا وجود جزیرے کے اندر باقی رہنا مشکل ہو جائے اور بالآخر یونان سے اس کا کلیتہً الحاق ہو جائے۔ ۴ ستمبر ۱۹۶۲ء میں باتابیہ نامی مقام پر اُس نے

تقریر کرتے ہوئے صاف کہا: "ایوکا تنظیم کی مہم اس وقت تک ختم نہیں سمجھی جا سکتی جب تک وہ قبرص کی حقیر ترک اقلیت کو پوری طرح سمندر کی نذر نہیں کر دیتی۔ اس اقلیت کا نسب اُن ترک نسل سے جا کر ملتا ہے جو تاریخ کے ہر موڑ پر یونانی نسل کی مستقل دشمن رہی ہے۔" ایوکا تنظیم یونان کی دہشت پسند تنظیم ہے جسے آرتھوڈکس کے متعصب عیسائی چلا رہے ہیں۔ اس تنظیم کا سربراہ رسوائے عالم شخص گریواس ہے۔ یہ تنظیم تعصّب، غنڈہ گردی، سفّاکی اور مسلم دشمنی میں اُسی درجے کی ہے جس درجے کی جن سنگھ تنظیم ہے۔

مکاریوس کی اصل پشت پناہ طاقت حکومت یونان ہے۔ ۱۹۶۰ء کے معاہدۂ آزادی کی رُو سے اگرچہ یونان پر لازم ہے کہ وہ مکاریوس کو دستور کی پابندی پر مجبور کرے مگر اس کے برعکس یہ حکومت اس بین الاقوامی ضابطے کی خلاف ورزی کر رہی ہے اور مکاریوس کی فتنہ پردازیوں سے تعاون کر رہی ہے۔ حکومتِ یونان نے اپنی باقاعدہ فوج کے دس ہزار افراد قبرص بھیج رکھے ہیں تاکہ وہ قبرصی عیسائیوں کے ساتھ مل کر مسلم آبادی کو نیست و نابود کرنے میں مدد دے سکیں۔ اور معاہدۂ اٹلانٹک کے تحت حاصل ہونے والا اسلحہ بیشتر یونان سے قبرص پہنچ رہا ہے جسے قبرص کی مشرقی بندرگاہ فاماگستا (FAMAGUSTA) پر اتارا جاتا ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف نے ۱۵ فروری ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ "قبرص میں گزشتہ ۲ ماہ کے اندر ۴۰ ہزار ہتھیار ناجائز طور پر داخل کیے گئے ہیں۔" اقوامِ متحدہ کے جنرل سیکرٹری نے اپنی ۱۰ ستمبر ۱۹۶۴ء کی رپورٹ میں بھی اس سازش کا انکشاف کیا ہے۔ یونان قبرص پر قبضہ کرنے کا خواب عرصۂ طویل سے دیکھ رہا ہے۔ اس خواب کی تعبیر سے وہ یونان کی اُس پرانی تہذیب کا احیاء کرنا چاہتا ہے جس کے ڈانڈے اسکندر اعظم سے ملتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے یونان نے مختلف ہتھکنڈے اختیار کیے ہیں جنگِ آزادی کے دوران جب قبرصی مسلمانوں اور یونانیوں کے درمیان کشمکش برپا ہوئی تو یونان نے فوراً اینوسیس اسکیم کے نام سے یہ تجویز پیش کر دی کہ قبرص کو یونان کے ساتھ ملا دیا جائے۔ ۱۹۶۴ء میں بھی وہ اس نظریے کو دُہرا چکا ہے۔ یونان کے وزیر اعظم پاپاندریو نے ۲۷ اکتوبر کو سلانیک

(سالونیکا) میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا ہے: "اینوسیس اسکیم کی کامیابی کے بعد قبرص کا تاریخی رُخ اسکندرِ اعظم کے راستہ کی طرف ہوگا"۔ اس اعلان کے ایک ہفتہ بعد صدر مکاریوس نے بھی یہ تصریح کردی کہ: "میری تمام تر جدوجہد اینوسیس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے وقف ہے۔ یہ نظریہ کبھی بھی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔ قبرص کا مسئلہ اگرچہ متعدد مرحلوں سے گزرا ہے مگر اس کے جوہری نظریے میں کبھی تغیر نہیں آیا۔ اینوسیس اسکیم کی کامیابی اور حدودِ یونان کی شمالی افریقہ تک توسیع میری دیرینہ آرزو ہے۔ اس ارادے کی تکمیل کے لیے میری جدوجہد برابر جاری رہے گی"۔

حکومتِ یونان اور قبرص کے صدر لارڈ بشپ مکاریوس کا یہ نظریہ نئے پروگرام کے ساتھ ۱۹۶۳ء کے اواخر سے قبرص کے ترکوں کو خون کے دریا میں نہلا رہا ہے۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۳ء کو دارالحکومت نیقوسیا میں جب مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کردیا گیا تو برطانوی اخبار گارڈین نے لکھا کہ "مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیے آج سے دو سال قبل تیاریاں شروع کردی گئی تھیں اور ایک خفیہ کمیٹی قائم ہو گئی تھی جسے فوج کی کمان سونپ دی گئی تھی"۔ نیقوسیا کے بعد دوسرے شہروں کی مسلم آبادی بھی یکایک غنڈہ گردوں کے ہاتھوں ہنگامہ ہائے دار و گیر اور ولولہ ہائے رستاخیز سے دوچار ہوگئی۔ اور آخر کار ۲۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ترکی کی فضائی فوج نے نیقوسیا پر پرواز کی اور مظلوم مسلمانوں کو وحشت و درندگی کے ہاتھ سے کسی قدر نجات ملی۔ اس ایک ہفتہ کی لڑائی میں ۹۹ مسلمان شہید ۷۰ زخمی اور ۴۱۵ لاپتہ ہوئے۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کا جو نقصان ہوا اُس کی تفصیل اقوامِ متحدہ کے جنرل سکرٹری کی ۱۰ ستمبر ۱۹۶۴ء کی رپورٹ کی رُو سے یہ ہے: ترکوں کے ۵۲۷ گھر بالکل مسمار کر دیے گئے ہیں، ۲ ہزار مکانات کو شدید نقصان پہنچا ہے، یہ تباہی جزیرہ کی ۱۰۹ بستیوں کے اندر ہوئی ہے۔ ۴ ہزار ترک ملازموں کو سرکاری خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ ۲۵ ہزار ترکوں کو اپنے شہروں اور بستیوں سے جبرًا بیدخل کیا گیا ہے۔ ۵۶ ہزار افراد انجمن ہلال احمر کے دست نگر ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ۲۵ ہزار وہ ہیں جو گھروں سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ ۲۳ ہزار

۵ سو وہ ہیں جو بے روزگار ہو گئے ہیں اور ۷ ہزار ۵ سو وہ ہیں جن کے رشتہ دار اس جنگ میں لاپتہ ہو گئے ہیں۔ ترک آبادی کی جس طرح شدید اقتصادی ناکہ بندی کی گئی ہے اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قبرص کی یونان پسند حکومت اس مسئلے کا حل اقتصادی دباؤ کے ذریعہ کرنا چاہتی ہے۔"

یونانی غنڈوں کی غارت گری برابر جاری ہے۔ اب تک ترک مسلمانوں کی نصف آبادی کا انخلاء کیا جا چکا ہے۔ ان کے گھروں کو بُری طرح لوٹا جا رہا ہے۔ گزشتہ سال ۲۸ لاکھ روپے کی مالیت کی گندم، ۳۰۰ لاکھ روپے سے زائد مالیت کا انگور اور انجیر اور ۶۳ لاکھ روپے کی مالیت کی سبزیاں لوٹ لی گئی ہیں یا چوری ہو گئی ہیں۔ تمام بندرگاہوں اور درآمدی مراکز پر یونانی غنڈوں کا قبضہ ہے اور سرکاری طور پر کوئی ترک درآمدی کاروبار نہیں کر سکتا۔ ترک آبادی فاقوں مر رہی ہے۔ باہر سے جو اعانت و امداد اُسے بھیجی جا رہی ہے وہ ان تک پہنچنے نہیں دی جاتی۔ ترکی کی انجمن ہلال احمر نے مختلف اقسام کا جو ۹۴۶ ٹن سامان روانہ کیا تھا وہ بھوک سے بلکتے بچوں اور فاقہ کش مردوں اور عورتوں تک پہنچنے نہیں دیا گیا۔ یہ سامان ابھی تک گوداموں میں پڑا سڑ رہا ہے۔ یونانیوں نے متعدد مساجد کو شہید اور بے شمار مساجد کو مقفل کر دیا ہے۔ کئی مسجدوں کو گرجاؤں میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔ قبرص کی مشہور یمنی مسجد جو اوقاف کے زیر انتظام تھی منہدم کر دی گئی ہے اور وہاں سڑک تعمیر کر دی گئی ہے۔

یونانی عیسائیوں اور مسلمان ترکوں کی یہ جنگ سیاسی اور اقتصادی سے زیادہ مذہبی نوعیت کی ہے۔ میکاریوس مسلمانوں کے قتل عام کے لیے جو اسلحہ وغیرہ خریدتا ہے اُس کے لیے وہ چندہ کی اپیل خالص مذہبی بنیادوں پر کرتا ہے۔ ایک طرف وہ قُبرص کا صدر ہے اور ایک ایسی ریاست کا سربراہ ہے جس کی ۶ لاکھ کی آبادی میں ۱۸ فیصد مسلمان ہیں اور ۴ فیصد دوسری غیر مسیحی اقوام ہیں۔ اور دوسری طرف وہ آرتھوڈکس چرچ کی طرف سے لارڈ بشپ کا عہدہ بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ اور اُس کی کار پر جو پلیٹ نصب ہے وہ "صدر جمہوریہ قبرص" کی نہیں بلکہ "قبرص کے لارڈ بشپ"

کی ہے۔

امریکہ کے لوگوں کا عام اندازِ فکر قبرص کی مسلمان آبادی کے معاملہ میں جو کچھ ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے۔ جن قبرصی مسلمانوں نے اپنے دفاع میں جانیں دی ہیں اُن کے بارے میں امریکی جریدہ لائف لکھتا ہے: "لاشیں پڑی ہیں، ان پر کوئی کفن نہیں ہے، نہ ان کے مذہبی مراسم ادا کیے گئے ہیں کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسلمان جہاد میں شہید ہو جائے وہ آٹومیٹک جنت میں داخل ہو جاتا ہے، اُس پہ دعا پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی"۔ عیسائیت کے تعصب کی یہ برہنہ تصویر ہے۔

دوسری طرف قبرص اور ترکی کے مسلمان بھی پورے دینی جذبہ سے اس ظلم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے محض قومی و وطنی جذبہ سے نہیں بلکہ اسلام کے وجود کے تحفظ کے جذبے سے قبرصی عیسائیوں اور غنڈوں کا مقابلہ کیا ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جو عیسائی اقوام کے لیے سوہانِ رُوح بن رہا ہے۔ کل قبرص کی سرزمین میں وہ اس جذبے کا رنگ دیکھ چکی ہے۔ آج پاکستان اور کشمیر کی سرحدوں نے اسی جذبے کا عکس اُن کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب عالمِ اسلام کے چپّے چپّے سے وہ اسی جذبے کی صدا گونجتی ہوئی سنیں گی۔ سوئٹزرلینڈ کے روزنامے ٹربیون ڈی جنیوا کے سیاسی تبصرہ نگار جان جاک چوٹیٹ نے اسی راز کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھا ہے: "ترک قوم سیاسی لیڈر مکاریوس اور آرتھوڈکس چرچ کے سربراہ مکاریوس میں کوئی تفریق نہیں کرتی۔ انہیں وہ تلخ کردار ابھی تک یاد ہے جس کا مظاہرہ ماضی میں اکلیریوس اُن کے ساتھ کر چکا ہے۔ انہیں یہ بھی پوری طرح معلوم ہے کہ قبرص کی ترک اقلیت جن مصائب میں زندگی بسر کر رہی ہے اُس کی تہ میں مذہبی عوامل کام کر رہے ہیں۔ ترکوں سے یہ حقیقت بھی اوجھل نہیں ہے کہ قبرص کا چرچ عین اس وقت بلغاریہ کے چرچ کو دعوت نامہ جاری کر رہا تھا جب صوفیا کی حکومت بلغاریہ کے ۹ لاکھ مسلمان ترکوں کی جلاوطنی کے احکام جاری کر رہی تھی۔ علاوہ بریں جزیرہ قبرص کا صلیبی جنگوں میں بھی خاص کردار رہا ہے۔ صلیبی جنگوں کا آغاز ہی اس وقت ہوا جب قبرص صلیبی جنگوں کا مضبوط مرکز بن گیا تھا۔ خود مغربی مصنفین کی

شہادتیں موجود ہیں کہ قبرص نے صلیبی ذہن کو پروان چڑھانے اور صلیبی آگ کو بھڑکانے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ بلکہ ایسے صلیبی بادشاہ گزرے ہیں جو بیک وقت قبرص اور بیت المقدس کے تخت بادشاہت پر متمکن رہے ہیں۔ مثلاً امالرک دوم (AMALRIC II) اور ہیوگ سوم (HUGH III) - اور اب آثار یہ بتا رہے ہیں کہ قبرص اور یونان کا آرتھوڈکس چرچ اسی ذہن کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے یونان اور قبرص کو وہی حیثیت دینا چاہتا ہے جو صلیبی جنگوں کے دَور میں تھی"۔

مسئلۂ قبرص میں یونان کا موقف تو صاف واضح ہے۔ اس مسئلہ کا دوسرا فریق برطانیہ ہے معاہدۂ آزادی کی رُو سے برطانیہ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ مکاریوس کی شر انگیزی کا قلع قمع کرتا۔ مگر برطانیہ نے اس معاملے میں بھی وہی منافقانہ روش اختیار کی ہے جو اس کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ مذہبی لحاظ سے برطانیہ کی دلچسپیاں ترکوں سے ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ چرچ آف انگلینڈ اور آرتھوڈکس اگر مذہبی روایات میں باہمی اختلاف بھی رکھتے ہوں تو وہ اسلام دشمنی میں یقیناً متحد ہیں۔ اسی طرح سیاسی لحاظ سے بھی برطانیہ قبرصی یونانیوں کو ترجیح دے گا۔ ایک طرف قبرص برطانوی دولت مشترکہ کا رکن ہے اور دوسری طرف برطانیہ کے دو ہوائی اڈے قبرص کے اندر موجود ہیں۔ اس لیے ظاہری چالوں کے باوجود اس فریق کا بوجھ حقیقت مکاریوس کے پلڑے میں جاتا ہے۔ ترکی حکومت نے اپنے قبرصی بھائیوں کی جو امداد کی ہے وہ ترکی کی عین اسلامی غیرت کا تقاضا ہے۔ دسمبر ۱۹۶۳ء میں جب اناضول سے صرف ۴۰ میل دور نیقوسیا کے اندر قبرصی مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہ رہی تھیں تو ترکوں کی اسلامی حمیّت ان مظالم کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکی۔ فوراً ترکی کی ہوائی طاقت حرکت میں آگئی اور نیقوسیا کے اوپر اس کے جہاز پرواز کرنے لگے۔ مکار مکاریوس نے یہ صورت حال دیکھ کر فوراً جنگ بندی کا اعلان کردیا۔ اس بروقت امداد کے علاوہ ترکی آج تک ان کی ہر طرح کی امداد کر رہا ہے۔ مگر مکاریوس کے علاج کے لیے مزید مؤثر اقدامات ضروری ہیں۔

عالم اسلام کی ہمدردیاں بالعموم قبرصی مسلمانوں کے ساتھ ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ پاکستان نے مسلمانوں کے ہر مسئلے کی طرح اس مسئلے میں بھی اپنے دینی بھائیوں کی پوری حمایت کی ہے۔ مگر یہ بات

انتہائی رنج کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ صدر ناصر نے کھلم کھلا ظالم میکاریوس کا ساتھ دے کر سارے عالم اسلامی کو حیران کر دیا ہے۔ یہ فعل نہ حق و انصاف کے مطابق ہے اور نہ اسلامی اخوت کے مطابق۔

سرِ دست اس مسئلہ کا صحیح حل وہی موزون ہے جس کا مطالبہ ترک کر رہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ قبرص کے اندر وفاقی نظامِ حکومت قائم کیا جائے۔ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو خانہ جنگی ہو چکی ہے اور عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے اس کی وجہ سے اب ان دونوں قوموں کا کسی وحدت کے اندر رہنا محال ہے۔ گزشتہ مظالم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ترک اقلیت کی جان و مال اور عزت و آبرو قبرصی یونانیوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے دونوں آبادیوں کو الگ الگ صوبے قرار دے کر انہیں ایک بالاتر وفاقی مرکز کے تحت کر دیا جائے۔ البتہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ مسلمان ممالک کا خواہ کوئی مسئلہ بھی ہو، کشمیر ہو یا قبرص، فلسطین ہو یا اری ٹیریا، اس وقت تک حل نہیں ہوگا جب تک مسلمان اقوام اپنا جداگانہ بلاک نہیں تشکیل دیتیں اور جب تک ملتِ اسلامیہ کو پوری طرح جذبۂ جہاد سے سرشار نہیں کیا جاتا۔

رسائل و مسائل

اللہ کے رازق ہونے کا مطلب

سوال - میں آپ سے قرآن مجید کی درج ذیل آیت کا صحیح مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا

(زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے)۔

مجھے جو بات کھٹک رہی ہے وہ یہ ہے کہ جب رزق کا ذمہ دار اللہ ہے تو بنگال کے قحط میں جو تیس ہزار آدمی ۱۹۴۳-۴۴ء میں مر گئے تھے ان کی موت کا کون ذمہ دار تھا؟

جواب - آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر جتنی مخلوقات ہیں ان سب کے رزق کا سامان خدا نے پیدا کیا ہے۔ یہ سامان اگر خدا نہ پیدا کرتا تو کون چھوٹے چھوٹے کیڑوں اور بھنگوں سے لے کر نوعِ انسانی تک، اس بے حد و حساب مخلوق کے لیے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق رزق فراہم کر سکتا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ مخلوقات میں سے کچھ افراد کبھی رزق نہ ملنے کی وجہ سے بھی مر جاتے ہیں، تو اس سے آخر یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اللہ کے رازق ہونے کا انکار کر دیا جائے؟ اول تو آپ ذرا یہ اندازہ کریں کہ مخلوقات میں سے کتنے فی کروڑ، بلکہ کتنے فی ارب ایسے ہیں جو رزق نہ ملنے کی وجہ سے مرتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ جس طرح خدا نے اپنی مخلوقات کے لیے زندگی کا بے حد و حساب سامان فراہم کیا ہے اسی طرح اس نے ان کے مرنے کے لیے بھی تو بے شمار اسباب پیدا کیے ہیں۔ روزانہ لاکھوں کروڑوں آدمی پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ مرنے والے

ایک ہی طرح نہیں مرتے بلکہ بے شمار مختلف صورتوں سے مرتے ہیں ۔ اور موت کی ان بے شمار صورتوں میں سے ایک صورت رزق نہ ملنا بھی ہے ۔ جب موت کا وقت مقرر آپہنچتا ہے اس وقت رزق کی موجودگی بھی کسی متنفس کو موت سے نہیں بچا سکتی ۔ صرف رزق ہی نہیں بلکہ زندگی اور موت کا سامان بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ۔ اس لیے عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا کے ساتھ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا بھی فرمایا گیا ۔

(ا ۔ م)

خوابوں کی پیروی

سوال :۔ "میں گزشتہ نماز جمعہ کے بعد سو گیا ۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ دو معمر سفید ریش بزرگ موجود ہیں ۔ میں قریب آیا تو ان میں سے ایک حضرت مولانا . . . . ہیں اور دوسرے ان سے زیادہ عمر رسیدہ ہیں ۔ مولانا . . . . مجھے علیحدہ تنہائی میں لے گئے اور فرمانے لگے کہ تم مولانا مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی کی حمایت چھوڑ دو ۔ یہ اچھی بات نہیں ۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی ۔ اس دن سے عجیب تردد ہے ۔ کیونکہ میں تو صرف متاثرین میں سے ہوں اور میری طرف سے جماعت کی حمایت للّٰہیت پر مبنی ہے ۔ اگر آنجناب کچھ تحریر فرما سکیں تو نوازش ہوگی ۔"

جواب ۔ اِس معاملہ میں آپ کو کوئی مشورہ دینا میرے لیے مشکل ہے ۔ آپ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اس خواب کی پیروی آپ کو کرنی چاہیے یا نہیں ۔ مگر میں اس بات کا کبھی قائل نہیں رہا ہوں ، نہ اسے صحیح سمجھتا ہوں کہ جن معاملات میں ہمیں بحالتِ بیداری ، آنکھیں کھول کر عقل و علم کی روشنی میں رائے قائم کرنی چاہیے اُن کا مدار ہم خوابوں پر رکھ دیں اور ایسی حالت میں اُن کے متعلق رائے قائم کریں جب کہ الہام یا اَضْغَاثُ اَحْلَام یا اغوائے شیطانی کے سارے امکانات کھلے ہوئے ہوں ۔ جو خواب آپ نے دیکھا ہے وہ تو بہت معمولی قسم کا ہے ۔ قادیانیوں میں سے

بکثرت لوگوں نے اس سے بدرجہا زیادہ گمراہ کن خواب دیکھ ڈالے ہیں جن کی بنا پر وہ راہِ حق سے منحرف ہو کر قادیانیت اور اسی قسم کی دوسری ضلالتوں کی جانب مائل ہو گئے۔

کتنا دُودھ پینے سے حُرمتِ نکاح لازم آتی ہے

سوال ۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ تسلیم شُدہ ہے کہ دودھ پینے سے حرمت واقع ہو جاتی ہے اور جن بچوں نے ایک ہی عورت کا دودھ پیا ہو ان کا باہمی نکاح نہیں ہو سکتا لیکن یہ میرے ذہن میں واضح نہیں کہ کتنی مقدار یا کتنی بار دُودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے ۔ مَیں نے ایک حدیث میں پڑھا ہے کہ ایک یا دو مرتبہ دودھ پینے سے حرمت نہیں ہوتی اور ایک دوسری حدیث میں یہ بات نظر سے گزری کہ پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمتِ نکاح ثابت ہوتی ہے ۔ لیکن عام طور پر علماء یہ بتاتے ہیں کہ دودھ خواہ ایک مرتبہ تھوڑا سا کیوں نہ پیا جائے ، اس سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے ۔ براہِ کرم واضح کریں کہ کتنی مقدار اور کتنی دفعہ دودھ پینے سے نکاح حرام ہوتا ہے ۔

جواب ۔ یہ مسئلہ فقہاء کے درمیان اختلافی ہے کہ حُرمتِ رضاع کتنی مرتبہ اور کتنی مقدار دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے ۔ فقہی مذاہبِ اربعہ میں سے حنفیہ اور مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ مطلقاً رضاعت سے حرمت واقع ہو جاتی ہے خواہ دودھ ایک ہی بار اور قلیل مقدار میں ہی پیا گیا ہو ۔ شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ پانچ مرتبہ دُودھ پینے سے حُرمت واقع ہوتی ہے اور حنبلی مسلک کے مطابق تین مرتبہ دودھ پینے سے نکاح حرام ہوتا ہے

شوافع کے مسلک کی بنا بعض ایسی روایات پر رکھی گئی ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ قرآن میں پہلے یہ حکم نازل ہوا تھا کہ دس مرتبہ دُودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے اور پھر یہ منسوخ ہو کر پانچ مرتبہ میں تبدیل ہو گیا لیکن یہ مسلک بہت کمزور ہے جسے کسی طرح قابلِ ترجیح قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ وجہ اس

کی یہ ہے کہ علم اصول کے محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کا متن اخبار احاد اور شاذ روایات سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ثبوت کے لیے قراءت و نقل کا تواتر درکار ہے۔ اس اصول کی روشنی میں وہ روایتیں قابل قبول اور لائق حجت نہیں ہو سکتیں جن میں غیر متواتر قرائتیں مذکور ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس مسلک کی بنیاد فقط قراءتِ شاذہ پر رکھی گئی ہو اور جس کے حق میں کتاب و سنت سے کوئی دوسری مضبوط دلیل موجود نہ ہو، اس مسلک کو قوی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسرا مسلک حنابلہ کا ہے جس کی رُو سے تین مرتبہ دودھ پینے سے حُرمت ثابت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض صحیح احادیث سے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ ان احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک ارشاد مبارک منقول ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک یا دو مرتبہ دودھ پینے سے حرمت واقع نہیں ہوتی۔ اسی سے فقہائے حنبلیہ نے یہ استنباط کیا ہے کہ حرمت ایک یا دو مرتبہ سے نہیں بلکہ تین مرتبہ کی رضاعت سے لازم آتی ہے۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ یہ احادیث کتاب و سنت کے عمومی حکم تحریم کو مقید کر کے ان میں تخصیص پیدا کرتی ہیں۔ اصولاً یہ استدلال صحیح ہو سکتا ہے اور اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ قرآن و حدیث میں ایک مقام پر عام حکم بیان کیا گیا ہے، لیکن دوسرے مقام پر اس کی کچھ تفصیل یا تخصیص بیان کی گئی ہے اور عمل اسی مخصوص یا مفصل صورت حکم پر کیا جاتا ہے۔

لیکن رضاعت سے متعلق جن احادیث پر حنبلی مذہب کا انحصار ہے، ان کے بارے میں ایک مشکل درپیش ہے اور وہ یہ ہے کہ جن احادیث سے ایک یا دو مرتبہ دودھ پینے سے عدمِ تحریم کا ثبوت فراہم کیا جاتا ہے، وہ اپنے مفہوم و مدعا میں پُوری طرح واضح اور ناطق نہیں ہیں۔ ان میں مصّۃ اور مصّتان، رضعۃ اور رضعتان، املاجۃ اور املاجتان کے الفاظ مروی ہیں۔ یہاں جو تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد مختلف اوقات میں دو مرتبہ دُودھ پینا بھی ہو سکتا ہے اور ایک ہی نشست میں بیک وقت دو دفعہ چھاتی چُوسنا یا دودھ پینا بھی ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ آنحضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہو کہ بچہ ایک وقت میں

اگر ایک یا دو چُسکیاں لگائے تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اس سے دودھ کا منہ تک پہنچنا یقینی نہیں ہوتا، لیکن دو سے زائد مرتبہ اگر بچہ دودھ چوسے تو دُودھ یقیناً اس کے مُنہ میں داخل ہو کر پیٹ تک چلا جائے گا۔ بہرکیف ان احادیث سے حنبلیہ کا استدلال اشکالات سے خالی نہیں ہے۔

اس کے بعد اب حنفیہ، مالکیہ اور ان دوسرے فقہاء و مجتہدین کا مسلک رہ جاتا ہے جو رضاعت کی ہر تعداد اور قلیل و کثیر مقدار کو موجب حُرمت قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کا استدلال قرآن و حدیث کی ان عمومی نصوص سے ہے جن میں علی الاطلاق تحریم رضاعت کا حکم بیان ہُوا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ . . . . وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ احرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں . . . . اور تمہاری رضاعی بہنیں)، اور حدیث میں ہے: یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب (جو رشتے نسب کے اعتبار سے حرام ہیں وہ رضاعت کے لحاظ سے بھی حرام ہیں)۔ ان نصوص میں مطلقاً رضاعت کی بنا پر نکاح حرام کیا گیا ہے اور رضاعت کا اطلاق ایک مرتبہ دُودھ پینے پر بھی اُسی طرح ہوتا ہے جس طرح زیادہ مرتبہ پینے پر ہوتا ہے۔ یہ مسلک فقط احناف و مالکیہ کا نہیں ہے بلکہ امت کی اکثریت کا مسلک یہی ہے۔ امام نووی نے شرح مسلم میں اسے جمہور علماء کا مسلک قرار دیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی مسوّیٰ شرح مؤطا میں لکھا ہے کہ اکثر فقہاء اسی طرف گئے ہیں۔

اس معاملے میں ایک پہلو جو مزید قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ آج کل طبائع میں اتنا فساد پیدا ہو چکا ہے کہ اگر لوگوں کو حنبلی مسلک پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور جہاں تین مرتبہ دودھ پلایا گیا ہوگا وہاں بھی یہ کہہ دیا جائے گا کہ دُودھ فقط ایک یا دو مرتبہ پلایا گیا ہے۔ رضاعت کی شہادت اور اس کے ثبوت کی فراہمی کا مسئلہ ویسے بھی اچھا خاصا پیچیدہ اور مشکل ہے۔ اب اس کے ساتھ اگر تعداد رضاعت کا سوال بھی تحقیق طلب بن جائے، تو اس سے بہت سے لاینحل نزاعات

پیدا ہوں گے، جن میں صحیح فیصلہ کرنا محال ہوگا۔

اِن وجوہ و دلائل کے پیشِ نظر اکثریت ہی کا یہ مسلک قابلِ ترجیح اور مبنی بر احتیاط قرار پاتا ہے کہ حرمتِ رضاعت کے حکم کو اس کے عموم پر رکھا جائے اور مجرد دودھ پینے کو موجبِ تحریم سمجھا جائے، خواہ دُودھ ایک وقت میں پیا جائے یا مختلف اوقات میں اور ایک گھونٹ پیا جائے یا کئی گھونٹ پیئے جائیں۔ (غ-ع)

موت، دُعا اور تقدیر

سوال:- اس وقت میں آپ کو یہ خط انتہائی پریشانی کی حالت میں لکھ رہا ہوں۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پیشتر میری اہلیہ کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا اور منجملہ دیگراں گنت فرائض کے پانچ بچوں کی پرورش اور مکمل نگہداشت کی ذمہ داری بھی پُورے طور سے مجھ پر عائد ہوگئی ہے تیس سالہ ازدواجی زندگی کے اس طرح یکایک منقطع ہو جانے سے جو صدمہ مجھے پہنچا ہے اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

جذبات کے اس تلاطم سے شیطان پُورے طور پر فائدہ اٹھانے میں مصروف ہے اور مختلف قسم کے پریشان کُن خیالات جو مارہائے خفتہ کی مانند دماغ کے کونوں میں دبکے پڑے تھے از سرِ نو بیدار ہو کر ذہنی انتشار میں اضافہ کا باعث بن رہے ہیں۔ اہلیہ کے انتقال کے فوراً بعد ہی سے یہ سوال دل و دماغ پر مسلط ہو چکا ہے کہ آخر وہ کونسا گناہِ عظیم تھا جس کی پاداش میں مجھے اور میری اولاد کو یہ سزا دی گئی اور اگر یہ واقعی گناہ کا نتیجہ ہے تو میرے معصوم بچوں کو اس میں کیوں شامل کر لیا گیا؟ اس کے جواب میں مجھ سے یہ کہا گیا ہے اور کئی مرتبہ میں بھی اپنے آپ سے یہی کہتا ہوں کہ ہر انسان بہر حال گناہ گار ہے اور اپنے گناہوں کی مغفرت کے لیے ہم جتنی بھی اللہ تعالیٰ کے حضور لجاجت سے دعا کریں کم ہے، مگر موت کی مصیبت چونکہ اللہ تعالیٰ کے

بڑے بڑے نیک بندوں پر بھی جن کی نظیر پیش کرنا شاید ممکن نہیں، آچکی ہے اور اس کے تلخ عواقب سے نہ صرف خود انہیں بلکہ ان کی بے مثال اولادوں کو بھی دوچار ہونا پڑا ہے، لہٰذا یہ حکم لگانا کہ فلاں موقع پر موت کا وقوع کسی خاص گناہ یا گناہوں کے کسی خاص مجموعے کی پیداوار تھا، غالباً درست نہ ہوگا۔

مزید براں دعا مانگنے کے بارے میں بھی متعدد ظنون و اوہام پیدا ہوگئے کہ یہ عمل واقعی وہ تاثیر رکھتا ہے یا نہیں جو عموماً اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ میں نے اور میرے بچوں نے مرحومہ کی صحت یابی کے لیے سینکڑوں دعائیں کیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے بعد سے میں نے دعا مانگنا ترک تو نہیں کیا مگر منافقت ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ اہلیہ کے بارے میں دعاؤں کے رائگاں جانے سے مجھے کمال درجے کی مایوسی نہیں ہوتی۔ میرے بچوں پر اس کا اثر بہت برا ہوا ہے اور وہ دعا کے قائل ہی نہیں رہے۔ پچھلے دنوں میں نے ان کو اس امر کی ترغیب دلانا چاہی تو وہ مجھ سے کہنے لگے کہ "آپ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خدا سے دعا کیا کرو۔ وہ سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ ہم نے اپنی ماں کے لیے بے شمار مخلصانہ دعائیں کیں مگر ایک بھی مستجاب نہ ہوئی۔"

علاوہ ازیں سب سے زیادہ ایک پیچیدہ اور تکلیف دہ سوال جو اس سے پیشتر بھی کئی دفعہ پیدا ہو چکا ہے مگر جس کی تلخی اور شدت موجودہ حالات میں کئی گنا زیادہ محسوس ہوئی وہ پیمانۂ عمر کی مقدار اور موت کے مقدر ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ حقیقت بصراحت مذکور ہے کہ موت کا وقت معین ہے اور وہ کسی طرح آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ اس کے بالمقابل مشاہدہ ہمیں بتلاتا ہے کہ خود ہمارے ملک میں جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جا رہی ہے افراد کی اوسط عمر میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اہلِ مغرب کی اوسط عمر مدتوں اہلِ مشرق کی اوسط عمر سے زیادہ رہی ہے اور آج بھی ہے۔ ان حقائق سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کی کمی بیشی شاید ان معنوں میں مقدر نہیں جن معنوں میں ہم اسے مقدر سمجھتے آئے ہیں بلکہ انسانی سعی و کوشش بھی عمر کے بڑھانے اور گھٹانے میں دخیل ہے۔ مجھے اس امر کا پورے طور پر احساس ہے کہ یہ سوال جبر و قدر کے عام مسئلہ ہی کا ایک جزو ہے اور اس میں محض استدلال کی مدد سے کسی صحیح نتیجے تک پہنچنا شدید

ممکن نہیں۔ مگر جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں محض یہ کہہ کر ان مسائل سے اعماض نہیں کیا جا سکتا

جواب: آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم کر کے افسوس ہوا۔ آپ کو اپنی اہلیہ مرحومہ کی وفات کے سبب سے جو اضطراب لاحق ہے اور جس ذہنی کیفیت سے آج کل آپ گزر رہے ہیں اس میں صبر کی تلقین کرنا گویا فطرت سے لڑنے کا مشورہ دینا ہے۔ لیکن درحقیقت اس صورتِ حال میں صبر کے سوا کچھ بھی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ صبر نہ کرے تو اس نقصان کی تلافی بہر حال نہیں ہو سکتی جو پہنچ چکا ہے، صرف اپنی تکلیف ہی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

آپ کا یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کی اہلیہ کی وفات کوئی سزا ہے جو آپ کو یا آپ کے بچوں کو دی گئی ہے۔ دراصل یہ سزا نہیں بلکہ ان بے شمار آزمائشوں میں سے ایک آزمائش ہے جو دنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو لازماً پیش آتی ہیں۔ دنیا میں کوئی انسان غیر فانی نہیں ہے۔ ہر ایک کو لازماً کسی نہ کسی وقت مرنا ہے۔ اور موت بہر حال اس شرط کے ساتھ نہیں آتی کہ مرنے والا اپنے پیچھے کوئی ایسا شخص نہ چھوڑے جس کے لیے اس کی موت وجہ پریشانی بن سکے۔ بچے، جوان، بوڑھے، سب مرتے ہیں۔ اکثر مرنے والے ایسی حالت میں مرتے ہیں جس سے بہت سے دوسرے انسانوں کے لیے رنج و غم کے علاوہ بہت سی الجھنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی بہت سی دوسری آزمائشوں کی طرح اس آزمائش سے بھی کبھی نہ کبھی انسان کو ضرور ہی سابقہ پیش آتا ہے۔ اس پر دل برداشتہ ہونے کے بجائے اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اس سے بخیر گزرنے کی طاقت بخشے اور ان مشکلات کو رفع کر دے جو اس سے رونما ہوئی ہیں۔

دُعا کے بارے میں بھی یہ سمجھ لیجیے کہ دعا ایک درخواست ہی ہے جو مالکِ کائنات سے کی جاتی ہے۔ مالک ہر دعا کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہے، اور نہ وہ اس شرط کے ساتھ مانگنی چاہیے کہ مالک لازماً اس کو قبول ہی کرے۔ ہمارا کام صرف اس سے التجا کرنا ہے۔ یہ اس کے مالک ہونے اور ہمارے بندہ ہونے کا عین تقاضا ہے۔ وہ قبول کرے تو اس کا کرم۔ نہ قبول کرے تو اس کو اختیار ہے۔ اگر معمولی انسانی حکومتیں بھی ہر سائل کی ہر درخواست کو قبول نہیں کرتیں اور ان کے قبول نہ کرنے کی وجہ بہت سی ایسی مصلحتیں ہوتی ہیں جنہیں سائلین نہیں جانتے، تو آخر کائنات کی حکومت کیسے ہماری ہر درخواست کو

قبول کر لینے کی پابند ہو سکتی ہے اور کائنات کا یہ نظام کیسے چل سکتا ہے اگر ہر دُعا مانگنے والے کی ہر ایک دُعا جُوں کی توں قبول کر لی جاتے۔

پیمانۂ عمر کے بارے میں جو سوال آپ نے کیا ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آج تک کسی تدبیر سے بھی انسان اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ ہر انسان کی عمر خود مقرر کر دے اور یہ طے کر دے کہ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے کوئی شخص نہ مرنے پائے گا۔ آج تمام انسانی تدبیروں کے باوجود ہر عمر کے آدمی مر رہے ہیں، عین ہسپتالوں میں مر رہے ہیں، اور ایسے ایسے باوسیلہ آدمی بھی مر رہے ہیں جن کو علاج کی بڑی سے بڑی ممکن سہولتیں میسر آسکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اعداد و شمار کی بنیاد پر بس یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کی اموات کی شرح کم ہوگئی ہے اور انسان کی اوسط عمر میں اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے ہاتھ میں عمر کا سر رشتہ آگیا ہے۔ درحقیقت جس طرح تمام شعبہ ہائے زندگی میں اللہ تعالیٰ بتدریج انسان پر قوانینِ کائنات کے اسرار کھول رہا ہے، اور رفتہ رفتہ اس کو مزید ذرائع پر دسترس عطا کر رہا ہے، اسی طرح انسانی امراض کے اسرار بھی وہ اس پر منکشف کرتا جا رہا ہے، ان کے علاج کے ذرائع بھی اس کو دیتا جا رہا ہے، اور اسی کے مطابق وہ انسان کی تقدیر بھی بدلتا جا رہا ہے۔ لیکن بہر حال تمام دوسرے معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی انسان کی تقدیر ہے خدا ہی کے ہاتھ میں۔ اور آج بھی جب کسی انسان کی موت کا وقت آجاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مرنے سے بچا نہیں سکتی۔

میرے خیال میں آپ کو موجودہ ذہنی پریشانی سے نکلنے میں جو چیز سب سے زیادہ مدد دے سکتی ہے وہ قرآن مجید کا غائر مطالعہ ہے۔ اگر میری تفسیر تفہیم القرآن آپ کے پاس ہو تو آپ اس زمانے میں فرصت کے اوقات زیادہ تر اس کے مطالعہ میں صرف کریں۔ امید ہے کہ اس سے آپ کو سکونِ قلب حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ (ا-م)

مطبوعات

تذکرۃ المفسّرین تالیف: جناب قاضی زاہد الحسینی صاحب۔ رکن ادارہ معارف اسلامیہ مقام اشاعت: دار الارشاد کیمبل پور، مغربی پاکستان صفحات ۱۵۸۔ قیمت درج نہیں۔

اس کتاب کے مصنف اس ملک کے ایک بالغ نظر عالم اور دردِ دل رکھنے والے بزرگ ہیں زیر تبصرہ کتاب ان کے تبحرِ علمی اور دینی بصیرت کی ہر لحاظ سے آئینہ دار ہے۔ اس میں انہوں نے سب سے پہلے تفسیر قرآن کے مبادی کو بڑے اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے اسی ضمن میں انہوں نے تفسیر صحیح اور تفسیر بالرائے کے درمیان جو فرق ہے اُس کی وضاحت کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ تفسیر صحیح میں مفسّرین کا منشا کلام الٰہی کو حاکم اور اپنی خواہشات کو محکوم کرنا ہوتا ہے۔ اور تفسیر بالرائے میں مفسّر اپنی رائے کو حاکم اور قرآنی ارشادات کو محکوم بنا کر اپنی رائے کو وزنی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر انہوں نے تفسیرِ قرآن کے لیے حدیث کی اہمیت پر بھی بحث فرمائی ہے اور دورِ حاضر کے بعض نئے مفسّرین کی فکری لغزشوں کا ذکر کرتے ہوئے ائمہ کے اقوال سے یہ ثابت کیا ہے کہ محض لغت عرب کا سہارا لیکر قرآن مجید کی تفسیر کبھی صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ منشاءِ وحی الٰہی جس طرح جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سمجھتے تھے اس کو محض لغت کا جاننے والا ادیب نہیں سمجھ سکتا۔ اس بنا پر وحی الٰہی کی جو تفسیر صاحبِ وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمائی ہے وہی تفسیر لغت کی اساس پر تیار ہونے والی تفسیر کے مقابلے میں صحیح اور راجح ہو گی۔

اس قابلِ قدر مقدمہ کے بعد فاضل مصنّف نے پہلی صدی سے لے کر دسویں صدی تک کے تمام مفسّرین کے حالات مختصر طور پر قلمبند کیے ہیں اور اس کے بعد کتب تفاسیر کی اجمالی فہرست مع سنین درج کر دی ہے۔ آخر میں اُن مقامات کا تعارف بھی کرا دیا ہے جن میں کلامِ الٰہی کے شارحین پیدا ہوئے۔

یہ کتاب یوں تو ہر علمی ذوق رکھنے والے کے لیے مفید اور کارآمد ہے مگر تفسیری ادب کا مطالعہ کرنے والوں کو اس سے نہایت اچھی رہنمائی مل سکتی ہے۔

فارقلیط تصنیف : جناب عبدالعزیز خالد۔ شائع کردہ : ایوان پبلشرز۔ ۴ فیض محمد فتح علی روڈ، پاکستان چوک، کراچی۔ قیمت دس روپے صفحات ۴۰۰۔

اس ملک کی بزم شعروادب میں حال ہی میں جن حضرات کو شہرت اور ناموری حاصل ہوئی ہے اُن میں جناب عبدالعزیز خالد ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں خالد صاحب نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں حضور سرورِ کائنات کی بعثت، صورت و سیرت۔ بلند مراتب، تعلیمات اور انسانیت پر عظیم احسانات کو نظم کیا ہے۔ اُن کا کلام اُن کی زبان و بیان پر قدرت اور وسعت مطالعہ کا ہر لحاظ سے ترجمان ہے۔ الفاظ کی بندش، استعارے، تشبیہات اور تلمیحات سب میں تازگی اور ندرت پائی جاتی ہے اور یُوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر پامال راہوں کو چھوڑ کر اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرنے میں منہمک ہے۔ اس میں اجنبیت کا احساس تو بلاشبہ ہوتا ہے لیکن اس سے جمود ٹوٹتا ہے اور تفکر و احساس کو آگے بڑھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ فاضل شاعر نے آخر میں تلمیحات کی تشریح کے لیے نہایت قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے۔ کتاب کا معیارِ طباعت نہایت اچھا ہے۔

ISLAM AND ITS CONTEMPERARY FAITHS

اسلام اور اُس کے ہم عصر مذاہب

تالیف : پروفیسر محمود احمد بریلوی۔ ملنے کا پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۵۲۹۴، کراچی۔ صفحات ۲۹۳۔ قیمت ۱۰ روپے

اس کتاب کے فاضل مصنف دنیائے اسلام کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ ایک مدت سے یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں دینِ حق کا پیغام پہنچانے میں سرگرم عمل ہیں۔ چونکہ وہ ان ممالک کے معاشرتی ماحول اور غیر مسلم تبلیغی اداروں کی سرگرمیوں سے براہ راست واقف ہیں اس لیے وہ اسلامی تعلیمات کو بہتر انداز اور سلیقے سے پیش کر سکتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اُن کی اسی کوشش کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں انہوں نے مناظرانہ طرز بیان سے ہٹ کر مذاہبِ عالم کا جائزہ لیا ہے اور ان میں اسلام کی امتیازی خصوصیات کو ابھارا ہے۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مستند معلومات پر مبنی ہے اور اس امر کا پورا پورا التزام کیا ہے کہ اُن کے قلم سے کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلنے پائے جس سے کسی کی دل آزاری ہونے کا احتمال ہو۔

جو حضرات مذاہب کے تقابلی مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لیے یہ قابلِ قدر کتاب بنیاد فراہم کرسکتی ہے۔ کتاب کا معیارِ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔

تعلیماتِ مجدّدیہ | تالیف: جناب ملک حسن علی صاحب بی، اے رجامعی، شائع کردہ: انجمن اشاعت التوحید والسنۃ، شرقپور۔ قیمت دس روپے۔ صفحات ۵۲۰۔

حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد زین العابدین الفاروقی ۱۰۳۴ھ جن کے تجدیدی کارناموں کی وجہ سے وہ دنیائے اسلام میں مجدّد الفِ ثانی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، اس برِصغیر میں امتِ مُسلمہ کے صحیح معنوں میں محسن ہیں۔ جس احول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اس پر مختلف فتنے چھائے ہوتے تھے۔ بدعات نے مسلم معاشرے میں پوری طرح جڑ پکڑ لی تھی۔ توحید کے خالص چشمے کو مشرکانہ افکار نے گدلا کر رکھا تھا۔ دین کے علمبرداروں پر نہ صرف اضمحلال طاری تھا بلکہ وہ خود بھی کئی قسم کی گمراہیوں میں بری طرح مبتلا تھے۔ اور سب سے بڑھ کر تختِ شاہی پر ایک ایسا بگڑا ہوا شخص مسلط ہوگیا جو سلطنت کے استحکام میں اسلام کو نقصان دہ سمجھتا تھا' اور جس نے تخت و تاج کی حفاظت کے لیے دینِ حق کے خلاف سازش کو ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس عاقبت نا اندیش بادشاہ نے اللہ کے دین کو مسخ کرنے کے لیے بڑی ہی ناپاک کوششیں شروع کیں اور اپنے مصاحبین کے ساتھ مل کر ایک باطل دین کو رواج دینے کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد صاحب سے دین کی خدمت کا کام لیا اور صحیح بات یہ ہے کہ اس عارف ربانی نے تجدیدِ دین کا پوری طرح حق ادا کیا۔ جاہلیت کا ہر محاذ پر بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور اس معاملے میں نہ تو بادشاہوں کے جبر و استبداد

کی پروا کی اور نہ ذہنوں کی بے حسی اور سرد مہری سے مضمحل ہوئے بلکہ اپنے فرض کو ہر حالت میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے چلے گئے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اللہ کے اس بندے کی کوششوں سے تاریخ کا دھارا بدل کر رہ گیا۔

مجدد صاحب کے تجدیدی کارناموں پر غور کرتے ہوئے برگسان کا وہ قول بار بار یاد آتا ہے جسے پروفیسر ٹائن بی نے اپنی کتاب مطالعۂ تاریخ میں قوموں کے عروج و زوال پر بحث کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ زوال پذیر اقوام میں اولیائے کرام کا کردار ہمیشہ ایک حیات آفریں دور کے آغاز کا موجب بنا ہے جس کی وجہ سے تہذیب انسانی میں ایک حیرت انگیز اور عہد آفریں انقلاب رونما ہوا۔

ملک حسن علی صاحب نے مجدد صاحب کے مکتوبات کو، جن میں ان کے تجدیدی کارنامے پوری آب و تاب کے ساتھ منعکس ہیں، بڑے سلیقے کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔

کتاب کا پیش لفظ مولانا محمد ناظم ندوی، سابق شیخ الجامعہ بہاولپور دیباچہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث، مغربی پاکستان اور تقدیم علامہ علاؤالدین صاحب صدیقی ایم۔اے صدر شعبۂ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی نے لکھی ہے اور ان تینوں بزرگوں نے ملک صاحب کی اس مساعی کی تعریف فرمائی ہے

مقالات سیرت | تالیف: ڈاکٹر محمد آصف قدوائی صاحب ایم۔اے پی ایچ۔ڈی شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ (بھارت) قیمت چار روپے آٹھ آنے صفحات ۲۴۰۔

بھارت میں مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام کا ادارہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں دین حق کی بیش قیمت خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اس ادارے سے آج تک جو کتب شائع ہوئی ہیں وہ نہ صرف مواد کے اعتبار سے وقیع اور مستند ہیں بلکہ جدید ذہنوں کو مطمئن کرنے والی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اس مفید سلسلہ کی ایک نہایت اہم کڑی ہے۔ کتاب کے فاضل مصنف کو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف فکر سلیم کی دولت سے سرفراز فرمایا ہے اور دوسری طرف انہیں تحقیق و تجسس کا ذوق بخشا ہے۔ اس کتاب میں یہ دونوں صفات پوری طرح نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو گہرے خلوص اور پوری عقیدت کے ساتھ لکھا ہے اور بڑی عمدگی سے اُن تمام اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں جو مستشرقین حضور سرورِ کائنات کی سیرتِ طیبہ کے متعلق بار بار اٹھاتے ہیں۔ فاضل مصنف کا اسلوبِ نگارش بڑا سادہ اور جاذب ہے اور انگریزی زبان کی اچھی نثر کی بہت سی خوبیاں اس میں جھلکتی نظر آتی ہیں۔

معیارِ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔

حیدر آباد کا عروج و زوال | جناب بدر شکیب صاحب ایڈوکیٹ۔ ناشر: عثمانیہ اکیڈیمی ۲/۱۹، پیر الٰہی بخش کالونی نمبر ۵۔ قیمت دس روپے۔ صفحات ۳۷۵۔

حیدر آباد کو ختم ہوئے پندرہ برس سے اوپر گزر گئے ہیں اور اس عرصہ میں اس ریاست کے عروج و زوال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لکھنے والوں میں مختلف خیال کے لوگ ہیں جنہوں نے اس المیہ کا اپنے اپنے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ بعض نے اس ریاست کی بربادی کو نظام کے عدمِ تدبر، خوش فہمی، مال و متاع کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی محبت اور بزدلی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے نظام کو ہر لحاظ سے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں حیدر آباد کے سابق وزیر اعظم میر لائق علی کی جو تصنیف ٹریجڈی آف حیدر آباد کے نام سے شائع ہوئی ہے اُس میں حکومت کے اُس موقف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اُس کی بربادی سے پہلے اختیار کیا گیا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب میں پورے دلائل کے ساتھ اس طرزِ فکر کی خامیاں واضح کی گئی ہیں۔ مصنف جن کا شمار اتحاد المسلمین کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں ہے انہوں نے اس المیہ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور بڑی بیباکی کے ساتھ اُن تمام عناصر کی لغزشوں کو بے نقاب کیا ہے جن کی وجہ سے ریاست حیدر آباد برباد ہوئی۔ یہ کتاب سقوطِ حیدر آباد پر ایک مکمل اور مستند دستاویز اور حقیقت نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

معیارِ کتابت و طباعت گوارا ہے۔ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

پاک معاشیات | تالیف: پروفیسر محمد مقیم شیخ شعبۂ معاشیات گورنمنٹ کالج، ملتان۔ شائع کردہ: ندر سنز، لاہور، کراچی، راولپنڈی۔ قیمت دس روپے صفحات ۲۷۶۔

جب سے پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی نے طلبا کو اس امر کا اختیار دیا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو امتحانات میں سوالات کے جوابات اردو میں بھی دے سکتے ہیں، اس وقت سے طلبہ میں تعلیم کا ایک نیا احساس اور شعور ابھرا ہے اور وہ مختلف مضامین کو اپنی قومی زبان اردو میں پڑھنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔ ان کے اس اشتیاق اور ضرورت کے پیش نظر ایف اے اور بی۔ اے کے نصاب بڑی تیزی کے ساتھ اردو میں مرتب ہو رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی نوعیت کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب پاکستانی معیشت کے مختلف پہلوؤں سے بڑی عمدگی سے بحث کرتی ہے۔ فاضل مصنف نے اس معاملے میں بڑی عرق ریزی کی ہے اور زیادہ سے زیادہ مستند اور جدید ترین اعداد و شمار کو کتاب میں اکٹھا کیا ہے۔ زبان دلچسپ اور رواں ہے۔ یہ کتاب اگرچہ بی۔ اے کے نصاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے مگر اس سے ملکی معیشت سے دلچسپی رکھنے والے سارے حضرات فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

تفسیر معارف القرآن جلد اوّل | تالیف: شیخ التفسیر والحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔ شائع کردہ: مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد ٹنڈو اللہ یار۔

اس فاضلانہ تصنیف کے فاضل مصنف دنیائے اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دینی علوم اور خاص طور پر تفسیر، حدیث اور فقہ میں جو انہیں غیر معمولی دسترس حاصل ہے وہ کسی صاحب علم اور صاحب بصیرت سے مخفی نہیں۔ یہ کتاب جو سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی تفسیر ہے، فاضل مصنف کے تبحر علمی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے بزرگ قرآن مجید کی تفسیر کے لیے کتنی محنت اور کاوش کرتے رہے ہیں۔ اور انہوں نے اس وادی میں قدم رکھنے سے پہلے کن علوم و فنون میں کتنی مہارت حاصل کی۔

اس تفسیر کا انداز بڑا عالمانہ ہے اس لیے صرف اہلِ علم ہی اس سے کما حقہٗ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا محترم کو اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

کتاب کا معیار طباعت اور کتابت عمدہ ہے۔ قیمت درج نہیں۔

مسلمانوں کے سیاسی افکار | تالیف: پروفیسر رشید احمد صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۴۳۲۔ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے۔

اس کتاب میں حکمائے اسلام یعنی فارابی، ماوردی، نظام الملک طوسی، غزالی، ابن الطقطقیٰ، ابن تیمیہ، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ، سرسید احمد خاں، جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کے سیاسی افکار کو قلمبند کیا گیا ہے۔ آغاز میں فاضل مصنّف نے قرآنی نظریۂ مملکت کے عنوان سے ایک مبسوط باب لکھا ہے۔ یہ کتاب مصنّف کے گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ حکمائے اسلام کے سیاسی نظریات کو جاننے کے لیے یہ کتاب بڑی مفید ہے اور مزید تحقیق و مطالعہ کے لیے اس سے قابلِ قدر رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

امیر حزب اللہ | تالیف: جناب ڈاکٹر عبدالغنی صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج، جہلم۔ شائع کردہ: ادارہ حزب اللہ، جلالپور شریف ضلع جہلم۔ قیمت اعلیٰ /۱۵۔ قسم ادنیٰ /۱۲ روپے۔ صفحات ۸۵۰۔

زیرِ تبصرہ کتاب جناب سید فضل شاہ صاحب، سجادہ نشین جلالپور ضلع جہلم کے حالاتِ زندگی، تعلیمات، کشف و کرامات و سیرت و کردار کا دلاویز مرقع ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کی تسوید و تدوین میں بڑی عرق ریزی اور محنت کا ثبوت دیا ہے اور شاہ صاحب کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے جو بڑے دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ہم یہاں صرف اس کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:-

"آپ (یعنی حضرت شاہ صاحب) جہاد بالنفس کے داعی بھی ہیں اور جہاد بالسیف کے بھی۔ جہاد بالسیف کی تبلیغ آپ نے اس زمانہ میں کی جب انگریزوں کی سنگینیں ہر وقت سر پر چھائی رہتی تھیں اور جہاد کا نام لینا بھی خود کو حکومت کا باغی بنانے اور موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ علمائے دین نے سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھ لیا تھا۔ ان حالات میں آپ نے السیاست فی الاسلام کا نعرہ لگایا . . . . . . آپ نے دلوں کو سوزِ عشق عطا کیا اور یہ درس دیا کہ اس سوز کو لے کر میدانِ عمل میں نکل آؤ اور جان کی بازی لگا دو کیونکہ اب حجرہ نشینی کا وقت نہیں ہے۔ آپ نے انبیاء کی سنّت پر عمل کر کے دعوت الی الحق دی اور نظامِ اسلامی کا قیام اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرایا۔"

کسی سجادہ نشین کا یہ لائحۂ عمل لائقِ ستائش ہے۔ ایک چیز جو ذہن کو بار بار کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے چند مقامات پر اپنے ممدوح کی تعریف و توصیف میں ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو شرعی نقطۂ نظر سے حزم و احتیاط کے خلاف ہیں۔

مطبوعات فرینڈز پبلیکیشنز ملتان ادارہ فرینڈز پبلیکیشنز ملتان ملک کے ان اشاعتی اداروں میں سے ایک ہے جو اشاعتی وسائل کو اخلاقی انارکی پھیلانے یا محض تجارتی کاروبار کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے، اپنے سامنے اسلامی خطوط پر تعمیر و اصلاح کا ایک واضح نصب العین رکھتے ہیں۔ اب تک ہمارے سامنے اس ادارے کی جتنی بھی مطبوعات آئی ہیں ان سب میں یہ خصوصیت موجود رہی ہے۔ اس وقت اس ادارے کی مندرجہ ذیل کتب ہمارے پیشِ نظر ہیں۔

قرآنی و نبوی دعائیں: مرتبہ مولانا خان محمد ربانی ضخامت: ۹۶ صفحات قیمت: ۲۵ پیسے۔ اس کتابچے میں مولانا خان محمد ربانی صاحب نے قرآن و حدیث سے دعاؤں کا ایک اچھا انتخاب پیش کیا ہے۔

نصابِ حدیث (تربیت گاہوں کے لیے) مرتبہ: مولانا معین الدین۔ ضخامت: ۴۳ صفحات قیمت:

۲۵ پیسے۔ اس کتابچے میں تربیتی اجتماعات میں اجتماعی مطالعے کی خاطر منتخب احادیث ترجمہ اور تشریح کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔

اسلامی معاشرے میں فرد کی حیثیت | مرتبہ: الحاج مولانا شبّیر احمد دہلوی۔ ضخامت: ۳۲ صفحات۔ قیمت: ۲۵ پیسے۔ اس کتابچے میں قرآن اور سنت کی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی معاشرے کی ماہیت، خصوصیات، دوسرے معاشروں کے مقابلے میں اس کی وجہ امتیاز اور اس میں فرد کی ذمہ داریوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

صفات المومنین مرتبہ: مولانا خان محمد ربانی۔ ضخامت: ۴۰ صفحات۔ قیمت: ۳۷ پیسے۔ اس کتابچے میں مولانا خان محمد صاحب ربّانی نے قرآن مجید کی وہ تمام آیات یکجا کر دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی پہلو سے مومنین کی صفات بیان فرمائی ہیں۔ تربیتی مقاصد کے لیے یہ کتابچہ مفید ہے۔

(بقیہ اشارات)

جو اُس نے عائد کر رکھی ہیں اور جو دن بدن شدید سے شدید تر ہو رہی ہیں یہ اسے کسی طرح زیب نہیں دیتیں۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ یہ حکومت اس معاملے پر جلد از جلد نظرِ ثانی کرے گی اور اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے اس کا پندار، اور مالی سود و زیاں کوئی چیز بھی اُس کی راہ میں حائل نہ ہو گی۔

چراغِ راہ

کا شمارہ دسمبر ٦٥ء

ستمبر کے ١٧ دنوں کی یادگار

ہماری تاریخ کے لافانی ایّام کی مکمل داستان

مندرجات

٦ ستمبر کو مجھ پر کیا گزری

ذاتی تاثرات کا رنگا رنگ مرقع

١٧ دن کا ادب

یہ دن ہمارے ادب کا سرمایۂ حیات ہیں۔ انہوں نے قلم کو نیا آہنگ دیا۔ تخلیقی قوتوں کے چشمے پھوٹ پڑے۔ شعر و نثر کا بہترین چیدہ اور ستھرا انتخاب جو اس دور کی ساری تخلیقات کا مطالعہ کر کے مرتب کیا گیا ہے۔

قیمت : —— ایک روپیہ

ضخامت : —— ١٠٠ صفحات

سرفروشی کے لازوال واقعات

لالہ صحرائی کے قلم سے

مغربی پریس، ہندوستان اور پاکستان

ایک مستقل تجزیہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا ط

عالم اسلام کا ردعمل، مسئلہ کشمیر، منظر و پس منظر

١٧ دن، یوم بہ یوم، جنگ کی ڈائری

اس جنگ میں ہم نے کیا کھویا، کیا پایا؟

ہندوستان نے حملہ کیوں کیا؟

ہندو ذہنیت کا تاریخی تجزیہ

سترہ دن اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان

اور دوسرے مضامین

ادارہ ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی یوسف منزل۔ ہرمزجی اسٹریٹ،

اسلام کے نظامِ سیاسی پر معرکہ آرا تصانیف

اسلامی ریاست

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر۔
- علماء، وطلباء، قانون و سیاست کے لیے ایک خزینۂ علم

قیمت قسم اعلیٰ بارہ روپے سستا ایڈیشن آٹھ روپے

سُنّت کی آئینی حیثیّت

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- سُنّت کیا ہے؟
- سُنّتِ نبوی کا دین میں صحیح مقام کیا ہے؟
- سنّتِ نبوی کی صحت و حفاظت کا ثبوت
- منکرینِ حدیث و سُنّت کا مُسکت و مدلّل جواب

آفسٹ کی حسین کتابت و طباعت قیمت ۸/۵۰ روپے

تحریکِ آزادیٔ ہند اور مُسلمان

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- قبل تقسیم مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی اور تمدّنی حالت کا نقشہ۔
- مسلمانانِ ہند کیلیے صحیح نصب العین اور طریقۂ کار کی نشاندہی۔
- برِ صغیر ہند و پاک کی پچاس سالہ ہنگامہ خیز سیاست پر بے لاگ تبصرہ

حسین کتابت و طباعت رنگین ڈسٹ کور قیمت صرف -/۱۰ روپے

الجہاد فی الاسلام

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلّل و مستند کتاب۔
- اسلامی قوانین جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانین جنگ سے موازنہ
- اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

قیمت قسم اعلیٰ ۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۷/۵۰ روپے

نظامِ اسلامی — مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

— مرتبہ: مولانا خلیل حامدی صاحب —

- مراکش سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام کے ممتاز رہنماؤں کی نگارشات کا مجموعہ۔
- ملّتِ اسلامیہ کے جسدِ خوابیدہ کو دعوتِ انقلاب و عمل
- معاندینِ اسلام کا بھرپور اور مدلّل جواب۔

۵۰۰ صفحات سے زائد۔ قیمت صرف ۶/۵۰ روپے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلامی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں؟
- اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق اور موازنہ
- اسلامی تہذیب کی برتری پر مدلّل تفصیلی بحث

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/۲۵ روپے

〃 سستا 〃 ۲/۰۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

اسلام کے نظامِ سیاسی پر معرکہ آرا تصانیف

اسلامی ریاست

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر۔
- علماء، طلباء، قانون و سیاست کے لیے ایک خزینۂ علم

قیمت قسم اعلیٰ بارہ روپے سستا ایڈیشن آٹھ روپے

سُنّت کی آئینی حیثیت

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- سُنّت کیا ہے؟
- سُنّتِ نبوی کا دین میں صحیح مقام کیا ہے؟
- سنّتِ نبوی کی صحت و حفاظت کا ثبوت
- منکرینِ حدیث و سُنّت کا مسکت و مدلل جواب

آفسٹ کی حسین کتابت و طباعت قیمت ۸/۵۰ روپے

تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- قبل تقسیم مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حالت کا نقشہ۔
- مسلمانانِ ہند کیلئے صحیح نصب العین اور طریقۂ کار کی نشاندہی۔
- برصغیر ہند و پاک کی پچاس سالہ ہنگامہ خیز سیاست پر بے لاگ تبصرہ

حسین کتابت و طباعت رنگین دسٹ کور۔ قیمت صرف ۱۰/- روپے

الجہاد فی الاسلام

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلل و مستند کتاب۔
- اسلامی قوانینِ جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانینِ جنگ سے موازنہ
- اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

قیمت قسم اعلیٰ ۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۷/۵۰ روپے

نظامِ اسلامی — مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

— مرتبہ: مولانا خلیل حامدی صاحب —

- مراکش سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام کے ممتاز رہنماؤں کی نگارشات کا مجموعہ۔
- ملتِ اسلامیہ کے جسدِ خوابیدہ کو دعوتِ انقلاب و عمل
- معاندینِ اسلام کا بھرپور اور مدلل جواب۔

۵۰۰ صفحات سے زائد۔ قیمت صرف ۶/۵۰ روپے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

— از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلامی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں؟
- اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق اور موازنہ
- اسلامی تہذیب کی برتری پر مدلل تفصیلی بحث

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/۲۵ روپے

〃 سستا 〃 ۳/۰۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

دین کی دعوت پھیلانے کیلئے مختصر اور جامع کتب

از:- سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱- بناؤ بگاڑ	،۵۰
۲- سلامتی کا راستہ	،۵۲
۳- اسلام اور جاہلیت	،۵۲
۴- توحید و رسالت زندگی بعد موت کا عقلی ثبوت	،۶۲
۵- دین حق	،۵۲
۶- شہادتِ حق	،۵۰
۷- اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	،۵۲
۸- تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	،۶۲
۹- اسلام کا نظریہ سیاسی	،۵۳
۱۰- اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	،۵۰
۱۱- جہاد فی سبیل اللہ	،۵۱
۱۲- انسان کے بنیادی حقوق	،۳۵
۱۳- اسلام اور عدلِ اجتماعی	،۴۰
۱۴- انسان کا معاشی مسئلہ	،۵۲
۱۵- اسلامی نظامِ تعلیم	،۶۲
۱۶- اسلام کا نظامِ حیات	،۶۲
۱۷- مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل	،۷۵
۱۸- ہدایات	،۵۰
۱۹- مسئلہ قربانی	،۵۰
۲۰- ختمِ نبوت	،۶۰
۲۱- مسئلہ تعددِ ازواج	،۲۰
۲۲- غلافِ کعبہ کی تاریخ	،۱۳
۲۳- شہادتِ امام حسینؓ	،۳۰

میزان ---- ۱۱،۳۶

- مندرجہ بالا کتب کی مجموعی قیمت ۱۱،۳۶ روپے ہوتی ہے۔ اگر آپ پورا سیٹ
- خریدیں گے تو ۱۱،۳۶ روپے کی بجائے آپ کو یہ سیٹ صرف ۹،۰۰ روپے

(علاوہ محصول ڈاک) میں ملے گا۔

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

برانچ:- ۱۶ بیت المکرم پہلی منزل۔ ڈھاکہ

کا انکار کیا تو پھر اُس کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر خدا مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہے تو پھر وہ کس چیز کو اپنا معبود بنائے۔ اس ذہنی اور جذباتی خلا کو اُس نے وطن کی محبت سے پُورا کرنا چاہا اور ملک اور قوم کو مالک الملک کے مقام پر رکھ کر اُس کی پرستش شروع کر دی۔ اس بنیادی غلطی سے فکر و نگاہ کے سارے زاویے بدل کر رہ گئے۔ چنانچہ جرمنوں کے ذہن میں سب سے پہلے یہ باطل خیال جاگزیں ہُوا کہ جو قوم جرمنی جیسے طاقتور "الٰہ" کی پرستار ہے، اُسی کو پُوری دنیا کی حکمرانی اور فرمانروائی کا حق حاصل ہے۔ اسی وطن پرستی نے بڑی تیزی کے ساتھ نسل پرستی اور قوم پرستی کی صورت اختیار کر لی۔ —————

————— اب جبکہ وطن، نسل اور قوم، اہلِ جرمن کے الٰہ اور معبود قرار پائے تو خیر و شر کے پیمانے بھی بدلنے لگے۔ اب حق وہ چیز ٹھہری جس سے جرمن قوم اور جرمنی کو فائدہ حاصل ہو اور باطل وہ چیز قرار پائی جس سے اہلِ جرمن کو نقصان پہنچے۔ دوسرے لفظوں میں حق صرف جرمنی کے گرد گھومنے لگا۔ اس غلط طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہُوا کہ حق و باطل کے وہ معروضی معیار (OBJECTIVE STANDARDS) جن کی وجہ سے انسانیت کے مختلف طبقات کے درمیان عدل و انصاف قائم ہے، یکسر ختم ہو گئے اور ایک قوم نسل پرستی اور وطن پرستی کے جنون میں گرفتار ہو کر آس پاس کی کمزور اقوام پر پل پڑی اور اس نے نہ صرف پُوری دنیا کے امن کو غارت کر کے رکھ دیا، بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں پر وہ ظلم ڈھائے جن کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

دُور نہ جایئے ذرا بھارت کے حالات پر غور کیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری چیز کو الٰہ بنانے کے کتنے بھیانک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک قوم جو پُوری دنیا کے سامنے امن کی دعویدار ہے، جو اپنے آپ کو اہنسا کا علمبردار کہتی ہے، وہ کشمیر کی بے بس مسلم آبادی پر کیسے خوفناک مظالم ڈھا رہی ہے۔ اُس کے قول و فعل میں اس شرمناک تضاد کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ اُس نے اپنے معبودِ حقیقی کو چھوڑ کر اپنے وطن اور اپنی قومیت کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ اُس کی اس مجرمانہ روش کی اللہ تعالیٰ نے اُسے یہ سزا دی ہے کہ اُس کے دل و دماغ سے حق و باطل کا امتیاز